Regd. No. L 3531

ادب لطیف — عظمت اور اجتہاد اسکی فطرت ثانیہ ہیں

سالنامہ ۱۹۴۷ء

- نقاد اس کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں
- تاریخ اس کو سنگ میل قرار دیتی ہے
- اہل ذوق اس کا ہر سال انتظار کرتے ہیں

ادب لطیف کھوکھلا دعوی نہیں کرتا، اٹل ثبوت پیش کرتا ہے—اس کا ہر سالنامہ تازہ زندگی، تازہ جوش و جنون اور تازہ عزائم کے ساتھ فن اور ادب کی فضاؤں میں پھیل جاتا ہے۔

سالنامہ ۱۹۴۷ء

بھی اپنے مستند، ترقی پسند نقادوں، شاعروں اور ادیبوں کی لافانی نگارشات کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کیا جائیگا

سامراجی قوتوں کی ریشہ دوانیاں، تمدنی اور تہذیبی ہیجانات، سائنس اور سیاست کے جدید ترین پلٹے، ادب اور زندگی کے نئے نئے تقاضے، اور عوامی رجحانات کے ارتقائی رخ—سالنامہ ۱۹۴۷ء کے ممتاز فنکار زندگی کے ان اہم اور ہمہ گیر مسائل پر اپنے صحت مند اور صالح افکار پیش کر رہے ہیں

سالنامہ کے چند فنکار

قاضی عبدالغفار باری۔ احتشام حسین۔ عندلیب شادانی۔ فراق گورکھپوری۔ عبادت بریلوی۔ کرشن چندر۔ سعادت حسن منٹو۔ احمد ندیم قاسمی۔ ممتاز مفتی۔ شفیق الرحمان۔ اختر اورینوی۔ حاجرہ مسرور۔ انور۔ ن۔ م۔ راشد۔ علی سردار جعفری۔ کنھیا لال کپور۔ دیویندر ستیارتھی۔ بلونت سنگھ۔ ساحر لدھیانوی۔ فکر تونسوی۔ اثر لکھنوی۔ شاد عارفی۔ حفیظ ہوشیار پوری۔ ضیا جالندھری۔ قتیل شفائی۔ عبدالحمید عدم۔ گوپال متل۔

ان کے علاوہ سالنامہ میں آپ کے تمام منفرد اور محبوب فن کار شمولیت فرمائیں گے

اپنی انفرادیت کی جوت جگاتا ہوا

اپریل میں شائع ہو رہا ہے

۳/-/-

مطبوعہ دین پریس، لاہور

نمبر شمارہ ۵ فروری ۱۹۴۷ء جلد نمبر ۲۴

مدیر: برکت علی چودھری

ترتیب

حفیظ ہوشیار پوری

گوپال متل

قتیل شفائی

فکر تونسوی

اشارات

اربابِ ذوق کو مژدہ ہو کہ ادب لطیف کا آئندہ شمارہ ——— سالنامہ ہوگا اور ان جملہ خصوصیات کا حامل ہوگا جنہوں نے ادب لطیف کو ملک بھر کے پرچوں میں ایک نمایاں اور منفرد حیثیت دے رکھی ہے۔

ادب لطیف کی روایات میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ اس کا ہر سالنامہ اس کے گزشتہ سالناموں سے بہتر ہو۔ اس کا شیوہ روایات کو نباہنا نہیں بلکہ روایت شکنی ہے۔ ادب لطیف جادۂ ارتقا کا راہی ہے اور اس کا ہر قدم اس سمت اٹھتا ہے جس طرف جانے کی کسی نے اس سے پہلے جسارت تک نہ کی ہو۔ ادب لطیف کے نزدیک سفر ارتقا کی کوئی منزل نہیں ہوتی اور اس کا راہرو کبھی اس تصور سے مطمئن نہیں ہوتا۔ کہ اس نے ترقی کے آخری زینے کو چھو لیا ہے۔

یہ اسی اجتہادی روش کا نتیجہ ہے کہ ادب لطیف نے ہر سال ایک نیا ریکارڈ قائم کیا اور ہر آئندہ سال خود ہی اس ریکارڈ کو توڑ دیا۔ اس کے ہر سالنامے کی اشاعت کے بعد نعرہائے تحسین بلند ہوئے اور اسے ایک کارنامہ قرار دیا گیا لیکن ادب لطیف کے کارکن اس تمام تعریف و توصیف کے باوجود یہی سوچتے رہے کہ ؎ گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

اس مرتبہ بھی ادب لطیف کا سالنامہ اسی اجتہادی شان کا مظہر ہوگا اور انشاءاللہ اسکے تمام گزشتہ سالناموں سے بہتر ہوگا۔ اراکین ادارہ متواتر کئی ماہ سے اس کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور ملک کے تمام مشاہیر اہل قلم نے اس سلسلہ میں تعاون کا یقین دلایا ہے۔ لہٰذا ادب لطیف کے خریدار اور سرپرست مطمئن رہیں کہ اس سال بھی ان کی توقعات کا پورا پورا احترام کیا جائے گا۔ اور ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں مایوسی نہ ہوگی۔

یہ رہی سالنامے کے ادبی محاسن کی بات۔ لیکن ایک اور پہلو بھی ہے جس کی طرف ہم قارئین کی توجہ مبذول کرانا اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ ملک کے ہنگامی قوانین کی رو سے ہر اخبار اور رسالے کے لئے کاغذ کا ایک خاص کوٹہ مقرر ہے اور اس کا اطلاق ادب لطیف پر بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا سالنامہ صرف محدود تعداد میں ہی شائع کیا جا سکے گا۔ اور زیادہ تر خریداروں کو ہی ملے گا۔ ان حالات میں آپ کو سالنامہ کے حصول کا ابھی سے انتظام کر لینا چاہیئے۔

سالنامہ کے حصول کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ آپ آٹھ روپے سالانہ چندہ بھیجکر رسالہ کے مستقل خریدار بن جائیں۔ اس صورت میں سالنامہ آپ کو مفت ملے گا۔ لیکن اگر آپ کو یہ صورت پسند نہ ہو تو بھی آپ اپنا پرچہ ابھی سے مخصوص کرائیں اور ہمیں لکھیں کہ ہم آپ کو سالنامہ -/۴/۳ روپے میں وی پی کر دیں۔ مستقل خریداروں سے بچنے کے بعد ہی سالنامہ بک سٹالوں پر بھیجا جا سکے گا۔

مستقل خریداروں کو ایک بات اور یاد رکھنا چاہیئے اور وہ یہ کہ سالنامہ صرف ایک مرتبہ بھیجا جائے گا اور گمشدگی کی شکایات پر دوبارہ پرچہ نہیں بھیجا جا سکے گا۔ لہٰذا اگر آپ اس امکان کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چار آنے کے ٹکٹ ارسال فرما دیں تاکہ سالنامہ رجسٹری کرایا جا سکے۔

سالنامہ اپریل میں شائع ہوگا۔ اور مارچ کا شمارہ شائع نہ ہو سکے گا۔ قارئین یہ بھی نوٹ فرمالیں۔

برکت علی

عندلیب شادانی

سرقہ اور توارد

جو لوگ شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ سرقہ اور توارد کا مفہوم بھی ضرور سمجھتے ہیں۔ لہذا سرقہ اور توارد کے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ان سے تعلق رکھنے والی چند ضمنی باتوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

علامہ تفتازانی نے مطوّل میں لکھا ہے کہ سرقے کا حکم اسی حالت میں لگایا جاسکتا ہے جب یہ امر یقینی ہو کہ ایک شخص نے دوسرے کا مضمون لیا ہے۔ ورنہ اسے توارد کہنا چاہیئے [1]

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ اگر تحقیق کی جائے تو شاید ہی کوئی ایسا شاعر ملے جو توارد مضامین سے بچ گیا ہو۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ تمام معلومات کا احاطہ فقط ذات باری کے لئے مخصوص ہے۔ شاعر تو اندھیرے میں تیر چلاتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ جو مضمون اس نے باندھا ہے وہ بالکل اچھوتا ہے یا پہلے کہیں بندھ چکا ہے۔

ابو طالب کلیم نے خوب کہا ہے کہ :-

منم کلیم بہ طورِ بلندیٔ ہمّت ✦ کہ استفادۂ معنی جز از خدا نہ کنم

(میں بلندیٔ ہمت کے طور پر کلیم ہوں۔ خدا کے سوا اور کسی سے استفادۂ معنی نہیں کرتا)۔

بہ خوانِ فیضِ الٰہی چو دست رس دارم
نظر بہ کاسۂ دریوزۂ گدا نہ کنم

(چونکہ فیض الٰہی کے خوان تک میری رسائی ہے اس لئے میں فقیر کے کشکول پر نظر نہیں ڈالتا)

دوائے علاجِ توارد نمی توانم کرد
مگر زباں بہ سخن گفتن آشنا نہ کنم

(لیکن توارد کا میرے پاس کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ میں شعر ہی نہ کہوں)

غالباً مرزا غالب پر بھی لوگ سرقے کا الزام لگاتے تھے۔ اور چونکہ وہ کوئی قطعی ثبوت اس امر کا پیش نہیں کر سکتے تھے۔ کہ ان کے یہاں سرقہ نہیں بلکہ توارد ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنے مخصوص فکاہی انداز میں ایک ایسی بات کہی جس نے سرقے اور توارد کا جھگڑا ہی مٹا دیا۔ بلکہ الٹا متقدمین کو سرقے کا مجرم بنا دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

ہزار معنیٔ سرجوش، خاصِ نطقِ من است
کز اہلِ ذوق دل و گوئے از عسل بردہ است

(ہزاروں معنی بلند خاص میرا حصہ ہیں جنہوں نے اہل ذوق کا دل چھین لیا ہے اور جو شیرینی میں شہد سے بھی بڑھ گئے ہیں)

ز رفتگاں بہ یکے گر توارد م رو داد
مداں کہ خوبیٔ آرائشِ غزل بردہ است

(اگر اگلے لوگوں میں سے کسی کے ساتھ مجھے توارد ہوگیا تو یہ نہ سمجھو کہ اس سے غزل کے حسن میں بٹّا لگ گیا)

حلاست ننگ و لے فخر او ست کاں بہ سخن
بہ سعیِ فکرِ رسا جا بداں محل بردہ است

(یہ بات میرے لئے باعثِ ننگ ہے لیکن اس کے لئے باعث فخر ہے کہ وہ اپنی فکر رسا کی کوشش سے اس مقام تک پہنچ گیا جہاں میری رسائی ہوئی ہے)

مبر گمانِ توارد یقیں شناس کہ دزد
متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل بردہ است

(توارد کا گمان بھی نہ کرو بلکہ یقین جانو کہ چور میرا مال خزانۂ ازل سے چرا لے گیا)۔

یعنی متقدمین کے بعض مضامین اگر غالب کے یہاں پائے

[1] مآثر الکرام۔ صفحہ ۶۹۔ حیدر آباد ایڈیشن

جائیں تو یہ سمجھنا چاہئے کہ درحقیقت یہ مضامین ازل میں غالب ہی کے حصّے میں آئے تھے۔ وہ لوگ (یعنی متقدّمین) وہیں سے چرا لے گئے۔ اب اگر غالبؔ نے ان مضامین کو اپنے نام سے پیش کیا تو کیا گناہ کیا کیونکہ دراصل وہ غالبؔ ہی کا مال تھے۔

حاصل اس بحث کا یہ ہے کہ جب توارد کا بھی امکان ہے تو کسی کے متعلق سوءِ ظن سے کیوں کام لیا جائے اور اسے سرقے کا مجرم کیوں گردانا جائے۔ بات یہ ہے کہ درحقیقت توارد کمتر اور سرقہ بیشتر واقع ہوتا ہے۔ اگرچہ سرقہ کرنے والا اپنی چوری کھل جانے کے بعد ہمیشہ اسے توارد ہی سے تعبیر کرتا ہے۔

شعرائے اردو میں شاید ہی کوئی شاعر ایسا نکلے جس نے بقدر استعداد فارسی شعرا کے کلام سے استفادہ نہ کیا ہو۔ اور استفادہ بجائے خود کوئی بری چیز نہیں۔ لیکن بدقسمتی سے حضراتِ شعرائے اردو کے افکار و مضامین کو اپنا زادۂ طبیعت بنا کر پیش کرتے رہے ہیں۔ سوءِ ظن کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔

اربابِ فن کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شاعر دوسرے کا مضمون لے کر ایسا شعر کہے کہ پہلے شعر سے بڑھ جائے تو پھر یہ سرقہ موردِ ملامت نہیں بلکہ سزاوارِ تحسین ہے۔ چنانچہ مولینا جامیؔ نے بہارستان میں سلمان ساوجی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"سلمان ساوجی نے دوسرے اساتذہ خصوصاً کمالِ اسمٰعیل کے اکثر مضامین کو اپنے اشعار میں باندھا ہے۔ چونکہ سلمان کے اشعار حسن و خوبی میں اپنے اصل سے بڑھ گئے ہیں اس لئے وہ قابلِ ملامت نہیں۔ قطعہ:۔

معنیٔ نیک بود شاہدِ پاکیزہ بدن + کہ بہ ہر چند در دو جامہ دگرگوں پوشند

(خوبصورت مضمون ایک شاہدِ پاکیزہ بدن کے مانند ہے۔ چاہے اسے کیسا ہی لباس پہنا دیں)

کسوتِ عار بود، بازپسین خلعت او

گر نہ در خوبیش از بیشتر افزوں پوشند

(اب اگر دوسرا لباس پہلے لباس سے بہتر نہیں ہے تو یہ دوسرا لباس اس کے لئے باعث ننگ و عار ہے)

ہنر است ایں کہ کہن خرقۂ پشمیں زیرش

بدر آرند و در او اطلس و اکسوں پوشند

(یہ بھی ایک ہنر ہے کہ اس کی کمبل کی گدڑی اتار کے، اسے ریشم و اطلس کے کپڑے پہنا دیں)

اسی خیال کو علامہ آزادؔ بلگرامی نے ایک شعر میں نظم کر دیا ہے اور وہ یہ ہے:۔

شاہدِ معنی کہ باشد جامۂ لفظش کہن

نکتہ دانے گر حریر تازہ پوشاند خوش است

(شاہدِ معنی جس کا جامۂ الفاظ پرانا ہو، اگر کوئی نکتہ سنج اسے ریشم کا نیا لباس پہنا دے تو کیا کہنا)

لہٰذا اگر یہ امر تحقیق بھی ہو جائے کہ ایک شخص نے دوسرے کا مضمون لیا ہے تب بھی ملامت میں عجلت خوب نہیں۔ پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ زیرِ بحث شعر حسن و خوبی میں اپنی اصل سے بڑھ گیا یا نہیں۔ اگر بڑھ گیا تو یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ مستحقِ ملامت نہیں۔ آخر اس نے کچھ تو اضافہ کیا۔ دنیا کی ہر چیز میں ترقی کا یہی اصول کارفرما ہے اور شعر بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں ہو سکتا۔ دخانی انجن کا موجد بیشک جارج اسٹیفن ہے۔ اور اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اس رینگنے والے انجن کو رفتہ رفتہ ترقی دے کر صبا رفتار بنا دیا وہ بھی اسٹیفن سے کم تعریف کے مستحق نہیں۔

سرقہ اور توارد کے درمیان اگرچہ قطعی فیصلہ دشوار ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نفسِ خیال میں تو توارد کا بہت امکان ہے۔ لیکن نفسِ مضمون کے علاوہ دونوں شاعروں کا پیرایۂ بیان بھی یکساں ہو اور تشبیہہ و استعارہ بھی جوں کا توں رہے یہ بات تقریباً ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں توارد کی بہ نسبت سرقے کا امکان زیادہ ہے۔

فارسی اور اردو کے دو شعروں کا مضمون اگر بالکل یکساں ہو تو سرقے اور توارد کے سوا ایک تیسری صورت بھی ہو سکتی ہے یعنی اردو

میں فارسی شعر کا ترجمہ کیا گیا ہو۔ اور ترجمہ نہ سرقہ ہے نہ توارد۔ فارسی نثر پاروں کا اردو نثر یا نظم میں اور فارسی اشعار کا اردو نثر میں ترجمہ کرنا اگر کوئی عیب کی بات نہیں تو فارسی اشعار کا اردو اشعار میں ترجمہ کرنا کیوں معیوب سمجھا جائے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ پڑھنے والے کو مطالعے کے وقت یہ بات معلوم ہو جانا چاہیئے کہ یہ ترجمہ ہے ورنہ قدرتی طور پر وہ سرقہ ہی سمجھے گا اور ایسا سمجھنے میں وہ ایک بڑی حد تک حق بجانب ہوگا۔

سطور آئندہ میں فارسی اور اردو کے ایسے اشعار پیش کئے گئے ہیں جن کے مضامین یکساں ہیں یا بہت زیادہ ملتے جلتے ہیں۔ یہ سرقہ ہے یا توارد اس کا فیصلہ قارئین خود کر سکتے ہیں۔

(۱) وقوعی تبریزی۔ می نماید کہ سر عہد شکستن داری

خشم ایں بار تو چوں رنجشِ ہر بار تو نیست

(ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم قطعِ تعلق کا ارادہ رکھتے ہو کیونکہ اس مرتبہ تمہاری خفگی ہمیشہ جیسی نہیں ہے)۔

غالبؔ — بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں

لیکن اب کے سرگرانی اور ہے

وقوعیؔ کے مصرعِ ثانی کا جو مفہوم ہے وہی مرزا غالبؔ کے پورے شعر کا ہے۔ وقوعیؔ نے پہلے مصرع میں جو کچھ کہا ہے وہ اگرچہ غالبؔ کے یہاں موجود نہیں پھر بھی غالبؔ کا انداز بیان کچھ ایسا ہے کہ ضمناً اس سے وہ بات پیدا ہو جاتی ہے جو مذکور نہیں۔ ہمارے نزدیک غالبؔ کا شعر اگر وقوعیؔ کے شعر سے بہتر نہیں تو کمتر بھی نہیں۔

(۲) مرزا مظہر جانِ جاناں - حیف درد کہ بہ خود ننگِ دوا بر داشت

بہر جانے نتواں نازِ مسیحا برداشت

(دا کے ہو اس درد پر جس نے علاج کی شرمندگی سہی۔ ایک جان کے لئے مسیحا کا احسان نہیں اٹھایا جا سکتا)

مومنؔ — منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی

زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے؟

یہاں بھی وہی صورت ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمۃ کے مصرعِ ثانی کے مضمون کو مومنؔ خاں نے دو مصرعوں میں پھیلا دیا ہے

اس میں شک نہیں کہ مومنؔ کا مصرعِ ثانی بہت تیکھا ہے پھر بھی ان کا شعر بہ حیثیت مجموعی مرزا صاحب کے شعر کے مقابلے میں بے جان ہے۔

(۳) ظفر خان، احسنؔ - ایں سخن از پیرِ کنعانم بہ خاطر ماندہ است

دیدنِ روے عزیزاں چشم روشن می کند

(پیر کنعاں کی یہ بات مجھے یاد رہ گئی ہے کہ عزیزوں کے دیدار سے آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں)۔

شہیدیؔ - سپیدی چشم کی زائل ہو دیدارِ عزیزاں سے

اڑایا ہم نے یہ نسخہ بیاضِ پیرِ کنعاں سے

شہیدیؔ کے شعر میں لکھنوی انداز کی لفظی صنعت گری تو ہے مگر وہ کیف و تاثیر نہیں جو احسنؔ کے شعر میں موجود ہے۔

(۴) عرفیؔ - چشم نہ بہرِ خویش دم نزع تر شود

ترسم کہ من بمیرم و غم در بدر شود

(مرتے وقت میں اپنے لئے نہیں روتا بلکہ اس ڈر سے روتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد غم در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرے گا)

غالبؔ - آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

عرفیؔ کے یہاں مضمون غالبؔ سے زیادہ ہے مگر غالبؔ کے اندازِ بیان میں بہت زور ہے۔ مضمون دونوں شعروں کا محض خیالی اور تاثیر سے خالی ہے۔

(۵) ملکِ قمیؔ - ز شوقِ سیرِ گلزار آں قدر فرصت نمی یابم

کہ در پائے گلے بنشینم و خارے بروں آرم

(سیر گلزار کا شوق اتنی مہلت نہیں دیتا کہ گلاب کے نیچے بیٹھ کے کانٹا نکالوں)

مظفر خاں گرمؔ - فرصت کہاں ہے اتنی جنوں میں کہ بیٹھ کر

تلووں سے اپنے خارِ مغیلاں نکالئے

مظفر خاں گرمؔ، رام پوری۔ حکیم مومنؔ خاں کے شاگرد تھے۔ ان کے پوتے فدا علی خاں صاحب مرحوم پروفیسر ڈھاکا یونیورسٹی، نے یہ دونوں شعر راقم الحروف کو سنائے تھے اور فرمایا تھا کہ ”دادا جان کہتے

لکھتے کہ دیکھو تو وارد اسے کہتے ہیں۔ یہ شعر کہے مدتیں گذر چکی تھیں کہ ملکِ قمی کا شعر نظر سے گذرا"۔

دونوں شعر اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں۔ مگر ملکِ قمی کے یہاں دوسرے مصرعہ میں گل اور خار کے تقابل سے آورد کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ گرم کا اندازِ بیان بہت نیچرل ہے۔

(۶) نعمت خاں عالی۔ نخواہد گفت ترکِ بت پرستی ہا دلِ زارم
کہ چوں سنگِ سلیمانی ست زنارے کہ من دارم

(میرا دلِ زار کسی حال میں بت پرستی چھوڑنے والا نہیں۔ میرا زنار سنگِ سلیمانی کی لکیروں کی طرح ہے۔ کہ جب تک وہ پتھر باقی ہے لکیریں بھی باقی ہیں)۔

سودا — ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

مصرعہ ثانی کا مطلب یہ ہے کہ شیخ لاکھ کفر سے گریز کرے اور زنار توڑ کے اس کے بدلے تسبیح پہنے۔ مگر تسبیح کے دانوں میں خود زنار موجود ہے اور اس زنار کا توڑنا شیخ کے بس کی بات نہیں۔ سنگ سلیمانی میں جو باریک باریک خطوط ہوتے ہیں انہیں کو زنار سے تشبیہ دی گئی ہے اور شاعر نے یہ بھی فرض کر لیا ہے کہ شیخ کی تسبیح سنگ سلیمانی کی ہے سودا کے شعر میں شکوہ اور طمطراق بہت ہے مگر مضمون محض خیالی ہے۔ عالی کا شعر واقعی عالی ہے۔

(۷) کمال اسمٰعیل اصفہانی۔ زخضر عمر فزوں است عشقبازاں را
اگر ز عمر شمارند روز ہجراں را

(اگر روز ہجر کو بھی عمر میں شمار کر لیں تو عاشقوں کی عمر خضر سے بھی زیادہ ہے)۔

غالب — بتلاؤں کیا، ہوں کب سے جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

پہلے مصرعہ میں کمال اور غالب کا مضمون جدا جدا ہے مگر دوسرے مصرعہ میں مشترک ہے۔ روز ہجر اور شب ہجر دونوں کا طول مُسَلَّم مگر نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو شب ہجر کی درازی روز ہجر کی درازی سے کہیں زیادہ ہے۔

(۸) آنند رام مخلص۔ ازاں ہر لحظہ در بر می کشم سروِ گلستاں را
کہ ایں رعنا جواں بسیار می ماند بیارِ من

(ہر لحظہ میں سروِ چمن کو اس لئے آغوش میں لیتا ہوں کہ وہ میرے محبوب سے بہت ملتا جلتا ہے)

ذوق — تیرے تصورِ قدِ رعنا میں آج ہم!
کیا کیا لپٹ لپٹ کے روئے ہیں سروِ چمن کیساتھ

ذوق کا اندازِ بیان سقم سے خالی نہیں۔ دوسرے مصرعہ سے یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ ہم بھی روئے اور سروِ چمن بھی رویا حالانکہ شاعر کا یہ مقصد ہرگز نہیں۔ بایں ہمہ ذوق کے شعر میں ایک خاص کیفیت ہے۔

(۹) میر والٰہی قمی۔ آمدی بر سرِ خاکِ من و شرمندہ شدم
کیں زماں از پے قربانِ تو جاں می بایست

(تم میری قبر پر آئے اور میں شرمندہ ہو گیا کیونکہ اس وقت مجھے تم پر سے جان نچھاور کرنی چاہئے تھی اور جان میرے پاس موجود نہیں)

میر تقی میر — ہمیں تو نزع میں شرمندہ آ کے اس نے کیا
رہا ہے ایک رمق جی سو کیا نثار کریں

میر صاحب کے پہلے مصرعہ کی بندش بہت سست ہے۔ "شرمندہ کیا" کے دو ٹکڑے ہو گئے اور "کیا" دور جا پڑا۔ میر والٰہی کا شعر بہت بلیغ ہے۔

(۱۰) جلال یزدی۔ از شوق تو صد بوسہ زنم بر دہنِ خویش۔
ہر گاہ کہ نام تو بر آید ز زبانم۔

(جس وقت تیرا نام میری زباں سے نکلتا ہے تو میں تیرے شوق میں سیکڑوں مرتبہ اپنا منہ آپ چومتا ہوں)۔

غالب — زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میری نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

جلال کے شعر میں اپنا منہ آپ چومنے کا ذکر ہے مگر عملاً یہ ممکن نہیں، اِلّا آئینے میں اور اس کا یہ محل نہیں۔ دوسرا، مطالعہ میں ایرانی

اساتذہ کے تین شعر اور بھی اسی مضمون کے نظر سے گذرے - قارئین کی ضیافت طبع کے لئے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

طالب آملی - چہ نامِ او برم از ذوق مدتے کارم
بجز لب و دہنِ خویشتن مکیدن نیست
(جب میں اس کا نام لیتا ہوں تو ایسی لذت حاصل ہوتی ہے کہ مدت تک اپنے لب و دہن کو چوستا رہتا ہوں)

حزیں - تا نامِ شب وصل تو آمد بہ زبانم
چوں شمع لبم می مکد از ذوق دہن را
(جب سے تیری شبِ وصال نام میری زبان پر آیا ہے تب سے شمع کی مانند میرے لب میرے دہن کو چوستے ہیں)

لا اعلم - نہیں نام چو تر کنم زباں را
جاں بوسہ دہد سرِ زباں را
(جس وقت میں زبان سے اس نام کو ادا کرتا ہوں تو میری روح میری زبان کو چوم لیتی ہے)

(۱۱) حزیں - قیامت است دراں دم کہ بہر زندہ شدن
اگر ز کوے تو خاکِ مرا جدا سازند
(جس وقت میری خاک زندہ ہونے کے لئے تیرے کوچے سے جدا کی جائے گی وہی ساعت قیامت ہوگی)

سوداؔ[1] - قیامت آئے گی اس دم کہ بہر جینے کے
تری گلی سے مری لاش کو اٹھائیں گے

بظاہر سوداؔ کا شعر حزیںؔ کے شعر کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے مگر ترجمہ اچھا نہیں ہوا خصوصاً "بہر جینے کے" بہت ہی بدنما ہے۔

(۱۲) میر مومنؔ - بہ گوش پنبہ نہم از صدائے خندۂ گل
دماغِ نالۂ بلبل دریں بہار کجاست
(اس بہار میں نالۂ بلبل کے سننے کا دماغ کسے یہاں تو خندۂ گل کی صدا بھی ناگوار ہے۔ چنانچہ میں تو کان میں روئی رکھ لیتا ہوں)

لا اعلم - مارا دماغ گلشن و باغے نہ ماندہ است
اے بوے گل برو کہ دماغے نہ ماندہ است
(ہمیں سیر چمن کی برداشت نہیں - اے بوئے گل! چلی جا کہ یہاں دماغ ہی نہیں رہا)

غالبؔ - فراق یار میں تکلیف سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

غالبؔ کا شعر فارسی کے دونوں شعروں سے کہیں بہتر ہے۔

(۱۳) صبوحی چغتائی - کبوتر نامہ ام بُرد و نہ شد معلوم حال او
مگر در رہ ز سوزِ نامۂ من سوخت بال او
(کبوتر میرا خط لے کر گیا اور پھر اس کا کچھ حال معلوم نہ ہوا۔ شاید میرے خط کے سوز سے راستے میں اس کے پر جل گئے)

تعشق لکھنوی - لکھا تھا خط میں انہیں حال آہ سوزاں کا
سنا ہے راہ میں بجلی گری کبوتر پر

دونوں شعروں کا مضمون خیالی ہے اس لئے تاثیر سے محروم ہے مگر اس میں شک نہیں کہ تعشق کے انداز بیان میں بہت تیکھاپن اور بلاغت ہے - صبوحی کا پہلا مصرعہ انداز بیان کے لحاظ سے بہت سپاٹ ہے۔

(۱۴) حامدی قمی - ز دل رشک آیدم گر بگذرد در دل خیال تو
چساں بینم کہ افتد چشم غیرے بر جمال تو
(اگر دل میں تیرا خیال گذرے تو مجھے اپنے دل پر بھی رشک آنے لگتا ہے - پھر بھلا میں اس بات کو کیونکر برداشت کر سکتا ہوں کہ غیر تجھے دیکھے)

غالبؔ - دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

خود اپنے پہ رشک آنا حقیقت کے خلاف ہے اس لئے دونوں شعروں کی بنیاد ہوا پر ہے پھر بھی حامدیؔ کے شعر میں جو اپنا اور غیر کا تقابل

---

[1] یہ شعر میں نے ایک قلمی بیاض میں سوداؔ کے نام سے لکھا دیکھا تھا۔ تحقیق کا موقع نہیں ملا کہ یہ شعر فی الواقع سوداؔ کا ہے بھی یا نہیں۔ - عندلیب شادانی

ہے وہ لطف سے خالی نہیں۔ غالب کا شعر بالکل سپاٹ ہے۔

(۱۵) قاسم کاہی - بروزِ ہجر مرا دیدہ بس گہر بار است
شبے کہ ماہ نہ باشد ستارہ بسیار است

(ہجر کے دن میری آنکھوں سے موتی برس رہے ہیں۔ جس رات چاند نہیں نکلتا ستارے بکثرت ہوتے ہیں)
اس شعر میں شاعر نے اشکوں کو تاروں سے اور محبوب کو چاند سے تشبیہ دی ہے۔

سراج دکنی - پی بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی
جس رات چاند نہیں ہے ستاروں کی کیا کمی

(۱۶) لا اعلم - ناخن تمام گشت معطر چو برگِ گل
بندِ قبائے کیست کہ وا می کنیم ما

(پھول کی پنکھڑی کی طرح ناخن معطر ہو گیا۔ یہ میں کس کا بندِ قبا کھول رہا ہوں)

انعام اللہ خاں یقین - کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند
برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

یقین کا شعر فارسی کو نہیں پہنچتا۔ فارسی شعر کے مصرعہ ثانی میں ایک عجیب والہانہ کیفیت ہے اور اندازِ بیان بہت دلنشیں ہے اس کے مقابلے میں یقین کا پہلا مصرعہ بہت سست ہے۔

(۱۷) جامی - آسماں جامِ نگوں داں کز مے عشرت تہی است
جستنِ مے از تہی ساغر نشانِ ابلہی است

(آسماں کو ایک اوندھا جام سمجھو جو شراب عیش سے خالی ہے۔ خالی جام سے شراب چاہنا حماقت کی نشانی ہے)
اسی مضمون کو ہمارے تین مسلم الثبوت استادوں نے باندھا ہے اور تینوں کا اپنا اپنا مخصوص رنگ نمایاں ہے:-

سودا - نہیں ہوں طالبِ رزق آسمان سے کہ مجھے
یقین ہے کاسۂ واژوں میں کچھ نہیں ہوتا

ذوق - مے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم
کہ آخر جب اسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا

غالب - مے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

ذوق کا شعر سودا اور غالب کے شعر سے کم تر درجے کا ہے سودا نیز غالب کا شعر جامی کے شعر کا ہم پلہ ہے۔ غالب کے یہاں غالباً اتفاقی طور پر ایک لطیفہ اور بھی پیدا ہو گیا ہے۔ انہوں نے "دو چار جام" بمعنی "چند جام" کہا ہے۔ لیکن "اک[۱] + دو[۲] + چار[۴]" مل کر سات ہوتے ہیں اور آسمانوں کی تعداد بھی سات ہی ہے۔

(۱۸) فرقتی جوشقانی - چہ شد اگر مژہ برہم نمی توانم زد
کہ لب بہ لب نہ رسیدہ است ہیچ دریا[1] را

(اگر میری پلک سے پلک نہیں لگتی تو کیا ہوا۔ کسی دریا کے کنارے آپس میں کبھی نہیں ملے)

کرم اللہ خاں درد - کنارے سے کنارہ کب ملا ہے بحر کا یارو
پلک لگنے کی لذت دیدۂ پُر آب کیا جانے

درد کے شعر میں "یارو" خواہ مخواہ کی ٹھونس ٹھانس ہے۔ فرقتی کا شعر بہت حسین ہے۔

(۱۹) لا اعلم - زغارتِ چمنت بر بہار منت ہاست
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

(چمن کو لوٹ کے تو نے بہار پر احسان کیا ہے کیونکہ پھول تیرے ہاتھ میں شاخ سے کہیں زیادہ تر و تازہ معلوم ہوتا ہے)

ابو القاسم - مرزا تخلص - ندیم ابو الحسن تانا شاہ، بادشاہ دکن، مرزا وہ نونہالِ چمن مٹ گئے کدھر
لگتا تھا جن کے ہاتھ پہ گل ڈال سوں اچھا

دونوں شعروں میں مصرعہ ثانی کا مضمون مشترک ہے۔ مگر نفس مضمون کے علاوہ فارسی شعر کے اندازِ بیان میں ایک عجیب البیلا پن ہے۔ مرزا کا شعر اس کو نہیں پہنچتا۔

(۲۰) ظہوری - گرچہ خردیم نسبتے است بزرگ
ذرۂ آفتابِ تابانیم!

---

[1] "دریا" فارسی میں عموماً سمندر کو کہتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی دریا پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ - عندلیب شادانی

(اگرچہ ہم چھوٹے ہیں مگر نسبت بڑی ہے۔ ہم آفتابِ تاباں کا ذرہ ہیں)

حسرت موہانی۔ پہلے اک ذرۂ ذلیل تھا میں
تیری نسبت سے آفتاب ہوا

ظہوری کا شعر پڑھنے کے بعد حسرت کا شعر بہت ہی ادنیٰ درجے کا معلوم ہوتا ہے۔

(۲۱) ملکِ قمی۔ رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

(پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لئے میں اک ذرا ٹھہرا تھا کہ محمل آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ایک لمحہ کی غفلت سے سو برس کی راہ کا فاصلہ ہو گیا)

اصغر گونڈوی۔ قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریقِ عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

ملکِ قمی کا شعر قیامت ہے۔ اصغر کا شعر اس کے سامنے نہایت پھسپھسا ہے۔

(۲۲) غنیمت۔ بگفتا قیمتش؟ گفتم نگاہے
بگفتا کمترک؟ گفتم گاہے

(اس نے کہا۔ اس کی قیمت؟ میں نے کہا۔ ایک نگاہ۔ اس نے کہا۔ کچھ کم؟ میں نے کہا کہ (وہی نگاہ) کبھی کبھی (سہی)۔ لطیفہ اس میں یہ ہے کہ "نگاہ" پہلے قیمت بتائی تھی۔ خریدار نے کہا کچھ کم کرو۔ بیچنے والے نے "نگاہ" میں سے "نون" کم کر دیا۔ صرف "گاہ" رہ گیا۔

جگر مراد آبادی۔ ایک تجلی، ایک تبسم، ایک نگاہ بندہ نواز
اس سے زیادہ اے غمِ جاناں دل کی قیمت کیا کہئے

جگر کا شعر بھی اچھا ہے مگر غنیمت کا شعر سبحان اللہ۔ ناز و نیاز کی ایک پوری داستان ہے۔

(۲۳) مرزا علی بیگ ندیم۔ از تو دل مہر و وفا می خواہد
سادگی بیں کہ چہا می خواہد

(دل تجھ سے مہر و وفا چاہتا ہے۔ ذرا اس کی سادگی تو دیکھ کہ کس چیز کا طالب ہے)

حسرت موہانی۔ وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں!

حسرت کا شعر ندیم کے شعر کا ترجمہ ہے اور بہت اچھا ترجمہ ہے۔

(۲۴) ملکِ قمی۔ خواب دیدم کہ ترا دست بدامن زدہ ام
در گریبانِ خودم بود چو بیدار شدم

(میں نے خواب میں دیکھا کہ تیرا دامن میرے ہاتھ میں ہے مگر جب جاگا ہوں تو دیکھا کہ اپنا ہی گریبان پکڑے ہوئے ہوں)

اصغر گونڈوی۔ سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

"خواب دیدم" کا مفہوم اصغر اپنے شعر میں داخل نہ کر سکے اس لئے شعر الجھ کر رہ گیا اور "جب آنکھ کھلی" کی تاویل کے بغیر مطلب ادا نہیں ہو سکتا۔ ملکِ قمی کا شعر "نشتر" کا درجہ رکھتا ہے۔

(۲۵) لا اعلم۔ خوبرویاں کشادہ رو باشند
تو کہ رو بستہ مگر زشتی

(حسین تو بے پردہ رہتے ہیں۔ تم نے جو اپنا منہ ڈھانکا ہے تو شاید تم بدصورت ہو)

جگر مراد آبادی۔ موسیٰ کی طرح کون سنے لن ترانیاں
بے عیب ہے جو حسن تو پردہ نہ کیجئے

جگر کے شعر میں پہلے مصرعہ کا اندازِ بیان حد درجہ رسمی قسم کا ہے اسی لئے شعر بے کیف ہو گیا۔

(۲۶) لا اعلم۔ شرمندہ ام کردی مگو عذرِ جفا زیں بیشتر
من از زیں مقدار ہم آزردہ خاطر نیستم

(تم نے تو مجھے شرمندہ کر دیا۔ بس اب اور زیادہ عذرِ جفا نہ کرو۔ میں تم سے اس درجہ بھی آزردہ نہیں ہوں)

حسرت موہانی۔ عذرِ ستم ضرور نہ تھا آپ کے لئے
حسرت کو شرمسارِ ندامت نہ کیجئے

فارسی شعر کے پہلے مصرعہ کا مضمون حسرت کے دو مصرعوں میں آیا ہے

اس لحاظ سے بھی حسرت کا شعر فارسی شعر کے مرتبے کا نہیں۔ اس کے علاوہ فارسی شعر کا دوسرا مصرعہ قیامت کا ہے اور اس کے برعکس حسرت کے پہلے مصرعہ کا اندازِ بیان بہت پھیکا ہے۔

(۲۷) نظیری۔ ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

(سر سے پاؤں تک جس جگہ نظر ڈالتا ہوں
دل اسی کی طرف کھنچنے لگتا ہے کہ سب سے بہتر یہی ہے)

جگر مراد آبادی۔ کس ادا پر جان دوں، تو ہی بتا اے حسنِ یار
جس ادا کو دیکھتا ہوں حسن کی تصویر ہے

نظیری کا یہ شعر اس کے بہتر نشتروں میں سے ایک ہے۔ جگر کا اندازِ بیان عامیانہ ہے اور یہ شعر خود جگر کے اچھے شعروں کے مقابلے کا بھی نہیں۔

(۲۸) عرفی۔ از درِ دوست چہ گویم بہ چہ عنوان رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم

(کیا بتاؤں کہ درِ دوست سے میں کس حال میں
واپس ہوا۔ سراپا شوق بن کر آیا تھا یکسر محرومی بن کر چلا)۔

حسرت موہانی۔ آئے تھے محفل میں تیری باہزاراں آرزو
یا چلے ہیں ایک لے کر خاطرِ ناشاد ہم

حسرت کے مصرعہ ثانی میں ناخوش گوار تعقید ہے "ایک" کا تعلق "خاطر" سے ہے یعنی "ایک خاطرِ ناشاد"۔ "ایک لے کر" بہت ہی بدنما معلوم ہوتا ہے۔ فعل کے بھی دو ٹکڑے علیحدہ علیحدہ ہو گئے "لے کر چلے ہیں"۔ اگر نظم نہیں ہو سکتا تھا تو اس طرح کہہ سکتے تھے۔ "یا چلے ہیں لے کے بس اک خاطرِ ناشاد ہم"۔ دونوں سقم بھی دور ہو گئے اور "بس" کے اضافے سے "اک خاطرِ ناشاد" میں زیادہ زور پیدا ہو گیا۔ عرفی کا شعر اس کے بہترین شعروں میں سے ایک ہے حسرت کا شعر اس کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔

(۲۹) حافظ۔ خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

(کرشمہ و ناز و خرام ہی کا نام حسن نہیں حسینوں میں ایسی بہت سی ادائیں ہیں جن کا کوئی نام ہی نہیں)

حسرت موہانی۔ اہلِ نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار
اک بات ان میں اور بھی ہے کچھ ورائے ناز

حافظ کا یہ شعر بھی ساتھ ساتھ پڑھنا چاہیئے۔

حافظ۔ شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد

ان دونوں شعروں کے مقابلے میں حسرت کا شعر بہت ادنیٰ درجے کا ہے۔

(۳۰) حافظ۔ تنت در جامہ چوں در جام بادہ
دلت در سینہ چوں در سیم آہن

(لباس کے اندر تیرا جسم ایسا ہے جیسے جام میں شراب۔ اور سینے کے اندر تیرا دل ایسا ہے جیسے چاندی میں پتھر)

حسرت موہانی۔ پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

حافظ کے پہلے مصرعہ کا مضمون حسرت نے دو مصرعوں میں کھپایا ہے۔ با ایں ہمہ حسرت کا شعر بہت پرکیف ہے۔ البتہ لفظ "عکس" قابلِ غور ہے کیونکہ شیشہ جس چیز سے گلابی نظر آتا ہے، وہ خود شراب ہوتی ہے نہ کہ شراب کا عکس۔ بہر حال یہ شعر حافظ کے شعر کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔

(۳۱) حافظ۔ ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(جس کا دل عشق سے زندہ ہو گیا وہ کبھی نہیں مرتا۔ ہماری ابدیت تو دفترِ عالم میں درج ہے)

حسرت موہانی۔ تجھ پر مٹے تو زندۂ جاوید ہو گئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے وفا کے بعد

حسرت کے شعر کا حافظ کے شعر سے کوئی مقابلہ نہیں۔ خصوصاً حسرت کا دوسرا مصرعہ بہت بے کیف ہے اور اس کا اندازِ بیان بالکل غیر شاعرانہ ہے۔

(۳۲) خواجہ غلام غوث بے خبر - بخت کجاست بیخبر تا بہ رکابِ او دوم
بر سرِ رہ نشستہ ام نیم نگاہم آرزوست

(اے بے خبر! ایسی قسمت کہاں کہ
اس کے ہمرکاب دوڑوں - راستے کے کنارے بیٹھا ہوا ہوں - بس
اتنی آرزو ہے کہ وہ مجھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لے)

حسرت موہانی - بیٹھے ہوئے ہیں ہم بھی سرِ راہ
گزرے ادھر سے شاید وہ ذی جاہ

یہاں بھی حسرت کا شعر بے خبر کے شعر کو نہیں پہنچتا۔
راقم الحروف نے بھی کبھی کبھی فارسی اشعار کو اردو کے سانچے میں
ڈھالا ہے چند نمونے حاضر ہیں :-

(۳۳) باباطاہر عریاں ہمدانی - بہ شو گیرم خیالت را در آغوش
سحر از بسترم بوئے گل آیو
(شب) (آید)

عندلیب شادمانی - بستر مہک رہا ہے مرا بوئے گل سے آج
تھا شب ترا خیال ہم آغوش خواب میں

(۳۴) طالب آملی - بہ سوئے خویشتن از لطف گستاخانہ کش دستم
کہ من بسیار محجوبم ، ہم آغوشی نمی دانم

عندلیب شادمانی - اپنے آغوش میں کیوں تم ہی مجھے کھینچ نہ لو
تم سے کھلتے ہوئے مجھ کو تو حجاب آتا ہے

---

(۳۵) آہی ترشیزی - مرا گویند مشکل ہائے عشق از صبر بکشاید
مرا صبرے اگر بودے نہ گشتے کار من مشکل

عندلیب شادمانی - صبر کی تلقین کرتے ہیں مرے غمخوار حیف
صبر ممکن ہو تو پھر رونا ہی کیا تقدیر کا

---

(۳۶) لاادری - آخر مہر و محبت نہ ہمیں سوختن است
تا چہا بر سرِ خاکسترِ پروانہ رود

عندلیب شادمانی - آخرِ مہر و محبت یہی جلنا تو نہیں
خاک پروانہ پہ دیکھیں ابھی کیا کیا گزرے

فکر تونسوی

بھولا بھالا

دراصل وہ میری توقعات کے بالکل برعکس نکلا ۔ اس کے نین نقش بھی تیکھے نہیں تھے، اس کے چہرے پر تیمی کے آثار بھی نہیں تھے ۔ اگرچہ رسماً وہ مزدور تیم نکلا ۔ بھٹے دار شلوار، جس کے پائینچوں اور بیچوں میں سرحد اور پنجاب گتھم گتھا تھے ۔ اچکن تو صرف طلسمی تکلف تھا، صرف رسم کا احترام ۔ ورنہ جب اس نے اچکن کا پردہ چاک کیا تو اندر سے صاف شفاف دھلا دھلایا قتیل شفائی نکل آیا —— پاؤں میں سیاہ پشاوری چپل اور سر پر گھنے دار بالوں کی بھری بھری لہروں نے اس دھلی دھلائی مشارت کی تکمیل کر دی، جسے میری سوچ سمجھی ہوئی توقع نے چھپا رکھا تھا —— اور پھر میں نے کہا کہ "ہاں اب ٹھیک ہے" اور وہ میری خواہش کی بے حیائی پر مسکرا دیا۔

قتیل شفائی انسان پہلے ہے اور شاعر بعد میں ۔ شاعر کے نقش و نگار کے متعلق روائتی تصور کو وہ اپنے سنگین ترین قہقہوں سے چکنا چور کر دیتا ہے ۔ مشرق کی اخلاقی قدروں کی لاش پر کھڑے ہو کر وہ اپنے پُر خلوص اور خاموش عمل کا اسم اعظم پڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے اگر وہ شاعر نہ ہوتا، تو اسے اس دنیا میں کوئی پسند نہ کرتا ۔ یہ اور بات ہے، کہ اس کی بیوی اس کی شاعری سے نہیں، بلکہ اس کے اندر چھپے ہوئے انسان سے محبت کرتی ہے —— اور یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا میں صرف اپنی بیوی سے شاکی ہے، جو اس کی انانیت سے محبت کر کے اسے زندہ رہنے پر متواتر اکساتی رہتی ہے، ورنہ اگر نامقبولیت کے اس چکر میں اُس کی بیوی کی محبت کا اٹکاؤ نہ ہوتا، تو وہ کب کا کوہ سلیمان کے آزاد قبائل میں جا لبسا ہوتا ۔ جہاں اس کے آباؤ اجداد کی روحیں، کھلی وادیوں، سنگین چٹانوں، خوفناک گھاٹیوں میں تہذیبی تضاد کے نوحے پڑھتی پھرتی ہیں، چیختی چلاتی پھرتی ہیں۔

لیکن اب تو وہ زندگی کے ایک مختلف راستے پر چل کھڑا ہوا ہے اب اُسے اس راستے کی جھاڑیوں، کانٹوں، گڑھوں اور پیچیدہ موڑوں سے ایک مسلسل اور دلچسپ جنگ کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے، اس جنگ کے ہتیار انتخاب کرنے میں بھی وہ ماحولی تضاد کو پیش نظر رکھتا ہے —— وہ اکثر سیدھا پن اختیار کرتا ہے ۔ لیکن شکست کھا جاتا ہے ۔ اور پھر ایسی شکستوں سے گھبرا بھی جاتا ہے، اکتا بھی جاتا ہے، اگرچہ اس پر بھی وہ فریق مخالف کی ذہنیت کو بد مذاق سمجھ کر اپنی شعوری عظمت کو سرنگوں نہیں ہونے دیتا ۔ اپنی رندی کو مستی میں بھی ہوشمند رکھتا ہے، لیکن غیر شعوری طور پر اس نے فتح مند فریق سے بیسیوں سمجھوتے کر ڈالے ہیں، مثلاً قتیل کے ساتھ شفائی لگا لیتا ہے تاکہ زہر کی تلخی قدرے کم ہو جائے ۔ شلوار کے ساتھ اچکن پہن لیتا ہے تاکہ اہل زبان کی جھنجلاہٹ ہونٹوں میں کٹ کر رہ جائے ۔ اور جب پہلے پہل کسی سے ملتا ہے، تو اپنی فطری کم نوشی کے باوجود بے تحاشا سگرٹ پھونکتا رہتا ہے تاکہ دنیا اُسے انسان کی بجائے شاعر سمجھے۔

بسا اوقات اس جنگ میں وہ ایک اور ہتھیار بھی استعمال کرتا ہے، اور وہ ہے "مضحکہ" —— یہ مضحکہ اس کی فطری صلاحیتوں میں شامل نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ایک غیر شعوری ردّ عمل ہے، بدمذاق ذہنیتوں کا، متضاد حقیقتوں کا ۔ اور نہائیت معصومانہ انداز میں جب وہ ایسا قہقہہ لگاتا ہے جو اس کا اپنا نہیں ہوتا تو اس کا روم روم جھوم اٹھتا ہے، دوسرے کی میان سے تلوار کھینچ کر اسی پر وار کرتا ہے۔

ایک بار یہی ہتیار جب اس نے صوبجات متحدہ کے ایک ترقی پسند شاعر پر چلایا تھا تو...... تو...... —— دراصل اُس لکھنوی شاعر نے جب یہ کہا تھا کہ "آپ یہاں ہیں؟" تو شاید اس کا مطلب تھا ۔ "آپ لاہور کیونکر تشریف لائے" —— لیکن فوراً ہی قتیل کا وہ "مضحکہ" بیدار ہو گیا ۔ اور وہ نہائیت سادگی آمیز شرارت کے ساتھ کہنے لگا ۔ "آپ کا مطلب اس کمرے سے ہے!" ——

اور جب تک وہ بچارا لکھنوی شاعر اپنے الفاظ کے معنوی ماخذ پر غور

کرتا محفل زعفران زار بن چکی تھی۔

وہ زندگی بھر انہیں ٹکراتی ہوئی سچائیوں سے نبرد آزما رہا ہے کبھی نقیرا خان جدون جیسے دورِ استبداد کے نمائندہ رئیس کے اخبار کی ادارت کرتا رہا۔ جو ڈپٹی کمشنروں اور گورنروں کی مدح سرائی میں قتیل سے قصیدے لکھواتا اور انہیں اپنے نام سے پیش کرتا رہا۔ کبھی ٹرانسپورٹ موٹر کمپنیوں کے اُن جاہل ازل سرمایہ داروں کے بینک بیلنس میں اضافے کرتا رہا۔ جو اسے "بابو عبدالقتیل" کہہ کر اس کی "عزت افزائی" کیا کرتے۔ کبھی میونسپل کمیٹیوں کی ان دفتری چکیوں میں پس پس کر اپنے مستقبل کو بہلاتا رہا۔ جہاں اس پر غبن کا الزام لگا کر اس کے انتقامی مضحکے کی پرورش ذِہ پرداخت کی جاتی رہی۔ اور کبھی اُسے "بھائی بنے" کے جمیل وشکیل جھانسے دے دے کر اپنے اغراض کی تکمیل کی جاتی رہی۔ اور پھر جب اسے بتایا گیا کہ "بھائی" بننے کے لئے اسے اپنا سیدھا پن چھوڑنا پڑے گا۔ تو اس نے سیدھے پن کو چھوڑنے کی بجائے ملازمت چھوڑ دینا زیادہ بہتر سمجھا۔

ملازمتوں کے اس لامتناہی اور استبدادی چکر میں جب اسے اس دورِ پیشین کی یاد آتی ہے، جب وہ لاکھوں میں کھیلتا تھا، جب وہ اپنے والد کی موروثی جائداد کے تین عظیم الشان حویلیوں کا مالک تھا ــــ تو اس کے چہرے پر ندامت اور غصے کی ملی جلی لہریں اُبھر آتی ہیں اور وہ اپنی سڈول انگلیوں کو ایک دوسرے میں مضبوطی سے پھنسا لیتا ہے، سگرٹ کا کش زور زور سے لگانے لگتا ہے۔ اور نہایت ارمان بھرے لہجے میں کہتا ہے "میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں، اپنے گاؤں میں جا کر اپنے مکان میں رہوں گا۔ اپنی گلیاں، اپنی بیوی، اپنے بچے۔ ــــ اپنا مکان، آزاد، پرندے کی طرح، پریوں کی طرح ــــ اڑتا پھروں گا، ناچتا پھروں گا، گاتا پھروں گا ــــ"

اُسے اپنی وہ کار ابھی تک یاد ہے، جو اس نے ایک کباڑیئے کی دکان سے آٹھ سو روپے میں خریدی تھی اور ہفتہ بھر بعد بیچ دی تھی۔ بیچنے کا یہ عمل صرف کار تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ اس نے اپنے سیدھے پن کے تحفظ، اپنے شاطر دوستوں کے احترام، اپنی انسانیت کی بقا اور اپنی شاعری کے احیاء کے لئے آبائی وراثت کی بیشتر چیزیں بیچ دیں۔ بگھی، تانگے، کار، قالین، مکان ــــ اور آخر میں اب اپنی انسانیت کو بازی پر لگا رہا ہے۔ وہ اس کھیل میں جیت جائے گا یا نہیں؟ وہ کبھی پریوں کی طرح آزاد ہو گا یا نہیں؟؟ وہ کبھی اپنے دوستوں کے نمائشی خلوص سے چھٹکارا پا سکے گا یا نہیں ؟؟؟ ــــ یہ سارے سوالیہ نشان اس کے دل سے اٹھتے ہوئے، اس کی چوڑی چکلی پیشانی سے ہوتے ہوئے، اس کے گچھے دار خوبصورت بالوں کی جڑوں تک پہنچ چکے ہیں۔ اور ہر روز کنگھا کرتے ہوئے بال بال ہو کر گرتے رہتے ہیں ــــ لیکن جن کو قتیلؔ شفائی ایک بے نیازانہ اور استہزائیہ انداز میں جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیتا ہے، کہ یہ اس کی انسانیت کی چٹان میں دراڑیں ڈالتے ہیں، اسے جگا کر اندھا کر دینا چاہتے ہیں۔ اسے سُلا کر مار دینا چاہتے ہیں۔ وہ ابھی تک ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اور جب بھی کبھی کوئی اسے جواب کی تھوڑی سی جھلک دکھانا چاہتا ہے تو وہ کہتا ہے "میں بھاگ جاؤں گا، میں اپنے گاؤں میں جا کر بس جاؤں گا"

"کاش! مجھے کبھی ایسی ملازمت مِل جاتی۔ جہاں دس بجے سے چار بجے تک کام کرنا پڑتا!" وہ مجسم آرزو بن کر کہتا ہے ــــ لیکن شاید اسے معلوم نہیں، کہ اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو گی۔ آزاد قبائل کا آزاد پنچھی۔ جب آزادی کی ایسی ضمنی آرزوئیں پیدا کرتا ہے۔ تو وہ زندگی کے ساتھ لڑی جانے والی اپنی جنگ کو بھول جاتا ہے۔ اپنے نئے راستے کو بھول جاتا ہے، ٹرانسپورٹ کمپنی، فقیرا خان جدون اور میونسپل کمیٹی کو بھول جاتا ہے۔ کتنا بھولا پن ہے۔ اس بھول جانے میں؟ لیکن کتنا خوفناک ہے یہ بھول جانا! ــــ

اُسے شاید یہ یاد نہیں رہتا، کہ ایسی خواہش کرنے سے پہلے وہ اپنے آپ کو کتنا بھلا چکا ہے، اپنی کتنی آرزوؤں کو جان بوجھ کر صرف اس لئے پاؤں تلے روند چکا ہے، کہ ان کی عدم تکمیل پر اُسے دُکھ کا احساس نہ ہو۔ اسے شاید یاد نہیں، کہ ایک بار جب آل انڈیا ریڈیو پر اسے اپنا نصب العین نشر کرنے کے لئے کہا گیا۔ تو اس نے نہایت کڑی سادگی کے ساتھ ہوا کی لہروں پر یہ گونجا دیا تھا۔ کہ

اس کا کوئی نصب العین نہیں، زندگی اور شاعری کے متعلق اس کا کوئی نظریہ نہیں، سگریٹ کے سرمئی مرغولوں میں جھلکتی ہوئی ایک بے نام سی جاذبیت اس سے شعر لکھواتی ہے اور پھر دنیا انہیں جھوم جھوم کر پڑھتی ہے، اور بس ——!

وہ "محبت اور عورت" کے فلسفہ میں دو عذابوں کا شکار ہے، اگر وہ محبت سے عورت کو الگ کر دے یا عورت سے محبت کو نکال دے۔ تو اس کی مصیبتیں حل ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے، میں عورت سے محبت کرنا چاہتا ہوں، لیکن کر نہیں سکتا۔ زندگی میں کتنی ہی عورتیں میرے قریب آئیں، میرے سانس سے سانس ملاتی ہیں۔ مجھ میں تحلیل ہو جانے کے لئے پگھلتی رہیں، لیکن میں ان سے دور تر ہوتا چلا گیا —— وہ محبت کرنا چاہتا ہے، اس لئے اول اول تو فوراً "پگھل جاتا ہے، لیکن پگھلتے پگھلتے اپنی محبت کو عورت کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے کسی دوسرے نشیب کی طرف لڑھکا دیتا ہے، اپنے ہی عرقِ انفعال میں گھل جاتا ہے، اور پھر بعد میں اپنے آپ پر جھلاتا ہے، اپنی شرافت پر، اپنی انسانیت پر، اپنے اخلاق کی سرسراتی ہوئی لاش پر —— لیکن یہ جھلاہٹ حقائق کے خلاف ہوتی ہے، اس لئے قطرۂ شبنم بن کر اڑ جاتی ہے اور وہ جھلاہٹ اور شرافت کے اس کے متضاد احساس کی رو میں گھر کر پھر گھبرا جاتا ہے اور چائے کی لبالب پیالی میں شکر کے دو چمچے اور ملانے لگ جاتا ہے۔ تاکہ وہ چھلک جائے، آنسوؤں کی طرح۔ تاکہ وہ بہ جائے سیلاب کی طرح۔ طوفان کی طرح۔

اس میں محبت کرنے کی جراٴت ہی نہیں ہے، اور جیسا کہ میں نے کہا ہے، اگر وہ زندگی کے کسی دور میں اس مرکّب کو جدا جدا کر سکا۔ تو اسے یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کہ اس کی اصلی شکل سے اس کی فوٹو زیادہ خوبصورت اور شکیل ہے۔ اور تصویر کے ذریعے وہ نسائی جذبوں کو موہت کر کے اپنے آپ کو دھوکا دینا نہیں چاہتا۔ —— لیکن کیا وہ واقعی اتنا خوبصورت نہیں، جیسا وہ محسوس کرتا ہے؟ —— مجھے اس کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے میں تامل ہے قتیل کا یہ تجاہلِ عارفانہ ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے حسن کے متعلق حسن ظن رکھتا ہے اگرچہ اسے دبا دبا کر رکھتا ہے، چھپا چھپا کر رکھتا ہے تاکہ تعریف کرنے والے کی بے ساختہ سچائی پر اخذِ لذت کر سکے۔ مکمل لذت۔ اور اگر موقع پائے، تو لذتیت کے اس دور کے درمیان میں ہی کبھی کبھی اپنے "مضحکہ" کی تلوار میان سے نکال لے۔ اور محفل زعفران زار بن جائے۔

اکثر لوگ اس کے مترنم گلے پر لٹو ہیں۔ لیکن مجھے اس کا ترنم کبھی پسند نہیں آیا۔ شاید اس لئے کہ میں اسے اعلیٰ شعریت کے لئے وجۂ جواز نہیں سمجھتا۔ یا شاید اس لئے بھی کہ میں خود ترنم کی اس دولت سے محروم ہوں، بہرکیف ؏

لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہونگے

کھانے پینے کے معاملے میں وہ پھر دوگونہ عذاب کا شکار ہے۔ پشاور کے تنوروں کی ایک فٹ قطر اور ایک انچ موٹی روٹیوں کا ذکر کرتا ہے تو لاہور کے مکلّف ہوٹلوں کی چپاتی اسے اپنے اوپر طنز کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جیسے کہہ رہی ہو" ابھی بچے ہو نا!" —— اور ادھر وہ اپنے بچپنے کے ثبوت میں ہر روز چائے پر —— بی منگھا رام کے انرجی فوڈ بسکٹ کا ڈبہ منگا لیتا ہے۔ بالائی اس کی مرغوب غذا ہے۔ اس اعتبار سے وہ ماجد علی شاہ کی سنّت کی پیروی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جس روز اسے بالائی نہ ملے اس روز بجھا بجھا سا رہتا ہے۔ جیسے اسے ایک فٹ قطر کی روٹی سے محروم کر دیا گیا ہو۔ جیسے اس سے اس کا بچپنا چھین لیا گیا ہو۔ اچھی سے اچھی غذا پر اپنی عمر بھر کی کمائی لٹا دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر اسے یہ تجویز پیش کر دی جاتی۔ کہ اپنے کلام کا مجموعہ پاؤ بھر بالائی کے عوض بیچ دو۔ تو وہ آپ کے حسنِ تجارت پر پھڑک اٹھتا۔ آپ کو گلے سے لگا لیتا۔ اور ملنے والی پاؤ بھر بالائی کا انتظار کرنے لگتا۔

لیکن اس قدر غذائی استواری کے باوجود زندگی نے اُسے ایسے لمحات کی تراوش بھی کی۔ جب اسے اپنی محبوب بیوی، اپنے دو ننھے بچوں اور اپنی ضعیف والدہ کے ہمراہ رمضانِ مقدس کے مہینے میں فاقے کرنے پڑے۔ اور یہ ظالم انسان اپنے بیاختہ

قہقہوں کے درمیان انہیں برداشت کرتا رہا۔ اپنی انانیت کو پالتا پوستا رہا۔ اور چہرے پر ایک شکن تک ایسی نہ آنے دی۔ جو للچا للچا کر کہہ سکے "یہ بھوکا ہے، ایک فنکار بھوکا ہے، ایک شاعر بھوکا ہے، ایک انسان بھوکا ہے —— !"

اس کے بہت سے دوست ہیں۔ ایسے بھی جو اسے معصوم سمجھتے ہیں، ایسے بھی جو اسے شاعر سمجھتے ہیں، ایسے بھی جو اسے فضول خرچ سمجھتے ہیں، ایسے بھی جو اس پر رحم کھاتے کھاتے خود اسے کھا جاتے ہیں۔ ایسے بھی جو اسے جان بوجھ کر کوئیں میں دھکیل دیتے ہیں۔ اور ایسے بھی جو اسے "بھائی" سمجھتے ہیں۔ ایسے بھی جو اس کی نظموں کا معاوضہ ہڑپ کر جاتے ہیں۔ لیکن ایسا کوئی نہیں، جو اسے انسان سمجھ سکے۔ انسان، جس کے اندر شاعر چھپا ہوا ہے شاعر، جو چھپے ہوئے انسان کو باہر نکالنا چاہتا ہے لیکن نکلنے نہیں دیا جاتا۔

اور جب قتیل شفائی کو ماحول کی بے وفائی کا یقین ہو جائیگا۔ اس دن وہ قتیل شفائی مر جائے گا۔ جو مخلص ہے اور اس کے ڈھانچے میں سے ایک دوسرا قتیل شفائی جاگ اٹھے گا، جس میں زندگی سے جنگ کرنے کی سپرٹ نہیں ہوگی۔ بلکہ اس سے سمجھوتہ کرنے کی، اس سے چال چلنے کی —— میں اس کے دوستوں سے آخر میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، کہ کیا ان کے خیال میں ایسا قتیل شفائی مر جانا چاہیئے۔ جو اپنی سچائی کے بل بوتے پر آپ کے جھوٹ کو سچ ثابت کر رہا ہے؟؟؟

اشتہار دہندگان کی خدمت میں ضروری التماس

سالنامہ ادبِ لطیف اپنی مستقل افادیت کی وجہ سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور عام اخباروں اور رسالوں کی طرح صرف پڑھ کر پھینک نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا اس میں شائع شدہ اشتہار مسلسل پروپیگنڈے کا باعث ہوتا ہے۔

اس مرتبہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ چند صفحات اشتہارات کے لئے بھی وقف کر دیئے جائیں۔ اشتہار دہندگان اپنے اشتہارات کے لئے جگہ ابھی سے مخصوص کرالیں۔

اُجرت اشتہارات حسب ذیل ہوگی :۔

ٹائیٹل و آخری صفحہ ——	اڑھائی صد روپیہ
ٹائیٹل صفحہ دو اور تین ——	دوصد روپیہ
خاص صفحہ مضامین کے درمیان ——	ڈیڑھ صد روپیہ
عام صفحہ ——	یکصد روپیہ

(مینیجر)

گوپال متل

سوشلزم اور مذہب

ہندوستان میں مذہب کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اپنی سیاسی اور اقتصادی غلامی کے باوجود ہم اس بات پر بہت نازاں ہیں کہ حکومت ہماری مذہبی آزادی کے راستہ میں حائل نہیں ہوتی۔ ایک مدت تک ہمارے بزرگ ملکۂ معظمہ کے اس اعلان کو سینے سے لگائے رہے کہ ہندوستان کے تمام مذاہب کے پیروؤں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کرنے کی مکمل آزادی ہوگی اور ان پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائیگی۔

یہ بات کہ ہندوستانیوں کو دراصل مذہبی آزادی حاصل ہے کہ نہیں دائرہ بحث سے خارج ہے ورنہ ہم بآسانی اقبال کا یہ شعر پڑھ سکتے تھے کہ ؎

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت　　ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

لیکن ہماری بحث کے لئے صرف یہی بات کافی ہے کہ ہمیں اپنی مذہبی آزادی بہت عزیز ہے اور کسی قیمت پر بھی ہم اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ان حالات میں اگر کسی سیاسی جماعت کے متعلق یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ وہ صرف مذہب کی مخالف ہی نہیں بلکہ اسے بزورِ شمشیر ختم کرنے کی خواہش بھی رکھتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا اچھے سے اچھا سیاسی اور اقتصادی پروگرام بھی اسے ہندوستان میں مقبول نہیں بنا سکتا اور لوگوں کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا ہونا لازمی ہے۔

سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے خلاف بدقسمتی سے یہی جذبات ابھارے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے جن کے حقوق پر سماج کی تشکیل جدید سے ضرب کاری پڑنے کا اندیشہ ہے ہندوستانی عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ سوشلسٹ برسرِ اقتدار آتے ہی مندروں اور مسجدوں کے دروازے جبراً بند کر دیں گے اور ہر اس شخص کو جو مذہب اور خدا میں یقین رکھنے کا مدعی ہو۔ گردن زدنی قرار دیدیں گے۔ شائد اسی قسم کے کسی امکان سے لرزہ براندام ہو کر اکبر نے یہ شعر کہا ہوگا ؎

رپٹ لکھوائی جا جا کر رقیبوں نے یہ تھانے میں　　کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مخالفین اشتراکیت کے معاندانہ پروپیگنڈے کے علاوہ بعض غلط اندیش اور خام قسم کے اشتراکی بھی عوام کو اس دھوکے میں مبتلا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ کہ مذہب کو بزورِ شمشیر ختم کر دینا ان کے پروگرام کی ایک اہم شق ہے۔ اس قسم کے غلط اندیش سوشلسٹ ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اور خود مارکس اور اینجلز کی زندگی میں بھی اس قماش کے بزرگ سوشلزم کو بدنام کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کا نام ڈیہورنگ تھا۔ یہ شخص ایک جرمن یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور سوشلسٹ بننے کے فوراً بعد اس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ سوشلزم کے فلسفہ کو ابتدا سے انتہا تک نظرثانی کی ضرورت ہے۔ اس احساسِ فرض کے پیش نظر اس نے متعدد کتابیں لکھیں اور اس وقت کے جرمن سوشلسٹوں پر اس کے غلط افکار کا کافی اثر پڑا۔ آخر اینجلز کو اس شخص کے گمراہ کن پروپیگنڈے کی تردید کرنا پڑی اور اس نے ڈیہورنگ کی تحریروں کو پڑھ کر ان کا مفصل جواب لکھا۔ یہ جواب ایک کتاب کی شکل میں شائع ہوا جس کا نام "اینٹی ڈیہورنگ" ہے۔ اینجلز کو اس سلسلہ میں کئی مہینے ضائع کرنے پڑے لیکن اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ ڈیہورنگ کی تردید کرتے وقت اس نے بعض اہم مسائل پر فیصلہ کن انداز میں روشنی ڈالی۔ اور اس طرح اس کی کتاب مستقل افادیت کی حامل بن گئی۔ دیگر امور کی طرح اینجلز نے اس کتاب میں مذہب کے متعلق سوشلسٹوں کے زاویۂ نگاہ کی وضاحت بھی کی ہے جس کی روشنی میں ہر شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ سوشلسٹوں کے متعلق یہ بدگمانی کہ وہ مذہب کو بزورِ شمشیر ختم کر دینگے کسی طرح بھی درست نہیں۔

ڈیہورنگ نے اپنی تحریروں میں اعلان کیا تھا کہ ایک سوشلزمی نظام میں مذہبی جادو کا تمام سلسلہ ختم کر دیا جائیگا۔ اور مختلف مذاہب کے تمام عناصر اس کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ اینجلز نے اس نظریہ کی زبردست تردید کی اس نے لکھا کہ ڈیہورنگ کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا مطلب یہ ہوگا کہ سوشلزمی نظام میں پولیس کو مذہب

پر حملہ کرنے کا حکم دے کر اسے شہید کا درجہ دے دیا جائے۔ تاکہ یہ امراس کی زندگی کو مزید طول دینے کا باعث بنے۔ یہ بات سوشلسٹوں کے مقاصد کے خلاف اور مذہب کے متعلق ان کے نظریئے کے بالکل متضاد ہے۔

اس کے بعد اینجلز نے سوشلزمی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے اینجلز کا کہنا ہے کہ مذہبی عقائد کے متعلق ہمارے مطالعے کا انداز تاریخی ہونا چاہیئے جس طرح ریاست کی ماہیت کا اندازہ لگانے کیلئے ہم پہلے اس بات کی تحقیقات کرتے ہیں کہ ریاست عالم وجود میں کس طرح آئی اسی طرح مذہب کے متعلق درست رائے قائم کرنے کے لئے بھی پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ اس کی داغ بیل کس طرح پڑی۔

مارکسیت کے معمولی طالب علم بھی جانتے ہیں کہ مذہب اس احساس بے بسی کا نتیجہ تھا جو انسان کو شروع شروع میں فطرت کی قہار اور جابر طاقتوں کے مقابلے میں محسوس ہوئی۔ لہٰذا جبتک انسان کا احساسِ بے بسی باقی ہے مذہب زندہ رہے گا اور اسے بالجبر مٹانے کی تمام کوششیں ناکام ہونگی۔ البتہ اگر سماج کا ماحول ایسا ہو کہ عام انسانوں کو اس احساسِ بے بسی سے نجات مل سکے تو شاید مذہب کی ضرورت ختم ہو جائے۔ اس صورت میں سوشلسٹوں کو مذہب کے خلاف جنگ کرنے کی بجائے اس اقتصادی اور سماجی نظام کے خلاف لڑنا چاہیئے جو عوام الناس کو غلامی اور ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرکے ان کے دلوں میں احساس بے بسی کو زندہ رکھتا ہے جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہو کہ انسان کے تمام عقائد اور افکار تاریخی عوامل اور خارجی ماحول کی پیداوار ہیں وہ بھلا کسی خاص عقیدے کیخلاف نبرد آزما ہونے کی حماقت کیونکر کر سکتے ہیں جن لوگوں کو یہ پورا پورا یقین ہو کہ سماجی نظام کی اصلاح فرسودہ عقائد کیلئے از خود ہی پیغام موت ثابت ہوگی وہ مذہب کو یہ کہنے کا موقعہ کیوں دیں کہ ؎ زہر غم کر چکا تھا میرا کام ؛ تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

سوشلسٹ اس امر کی بڑی ہی کوشش کرتے ہیں کہ ان کو غیر ضروری دشمنوں کے خلاف لڑنا نہ پڑے لیکن مذہب کے اجارہ دار بعض اوقات ان پر بلاوجہ حملہ کر دیتے ہیں اور مذہب کی غلط تاویلوں سے انسانیت کے سفر ارتقا میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جاتے ہیں، مثال کے طور پر سپین کی خانہ جنگی میں وہاں کے تمام پادریوں نے رجعت پسندوں کا ساتھ دیا اور جاگیردارانہ نظام کی حمایت کرتے ہوئے وہاں کے عوام پر بے پناہ مظالم توڑے۔ اب ظاہر ہے کہ ترقی خواہ افراد اور جماعتیں اس قسم کے پادریوں کو معاف نہیں کر سکتیں لیکن جب اسی قسم کے ایک پادری کو یوگوسلاوی عوام کے خلاف غداری کرنے کے الزام میں سزا دی گئی۔ تو یوگوسلاویہ کے قائد مارشل ٹیٹو پر پوپ کا روحانی عتاب ٹوٹ پڑا اور اسے "مقدس بھیڑوں" کے زمرے سے خارج کر دیا گیا۔

صرف سوشلسٹ ہی نہیں بلکہ ہر ترقی پسند تحریک کو قدامت پسند لوگوں کی مخالفت سے پالا پڑا ہے اور یہ مخالفت بیشتر اوقات مذہب کے نام پر ہی کی جاتی ہے۔ مثلاً ترکی کے قدامت پسندوں نے کمال پاشا پر کفر کا فتوےٰ لگایا اور افغانستان کے بیدار مغز حکمران امان اللہ کو اسی قماش کے لوگوں نے جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔ حال ہی میں یوپی کے مولویوں نے جاگیرداری کے تحفظ کو جزوِ مذہب قرار دے کر ملک کی ترقی خواہ جماعتوں کو ایک اور الجھن میں ڈال دیا ہے۔

اگر مذہب اسی قدامت پسندی اور اوہام پرستی کا نام ہے جس کا مظاہرہ ترقی دشمن افراد کی طرف سے ہوتا ہے تو اس صورت میں سوشلسٹوں کو خصوصیت سے مذہب کا مخالف کہنا کھلی ہوئی بددیانتی ہے۔ کیونکہ اس معاملے میں تو ہر وہ شخص ان کا ہمنوا ہے۔ جو جذبات کی بجائے عقل سے کام لینے کا عادی ہے۔ البتہ مذہب اگر ان پارینہ عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ چند اخلاقی اقدار کا مجموعہ ہے تو اس میں اور سوشلزم میں کوئی تضاد نہیں اس صورت میں سوشلسٹ نہ صرف مذہب کے مخالف نہیں ہیں بلکہ اس کے سرگرم مبلغ ہیں کیونکہ جب تک موجودہ نظام کی خامیوں کو دور نہ کیا جائے حقیقی مذہب کو عملی جامہ پہنایا ہی نہیں جا سکتا شاید اسی حقیقت کے پیش نظر برطانیہ کے سب سے بڑے تمثیل نگار برنارڈ شا نے سٹالن کو دنیا کا سب سے بڑا مذہبی انسان قرار دیا ہے۔

مذہب کے متعلق اشتراکیوں کے رویہ کو غلط انداز میں پیش کرنے والے اگر اشتراکی روس کے متعلق بھی تھوڑی بہت واقفیت حاصل کریں تو ان کے تمام خدشات کا ازالہ ہو جائے جنگ سے پہلے سامراجی طاقتوں نے روس کو بدنام کر رکھا تھا کہ وہاں اہل مذاہب پر سختیاں روا رکھی جاتی ہیں لیکن جب جنگ کی وجہ سے روس کے حقیقی حالات پر سے پردہ سرکا تو اس تمام پروپیگنڈے کا تار و پود بکھر گیا اور خود اتحادی سیاستدانوں کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ حکومتِ روس مذہب کے خلاف نہیں۔ اگر واقعی روس مذہب کا دشمن ہوتا تو روسی مسلمانوں کے مفتیٔ اعظم روس کی حمایت میں مقدس جہاد کا اعلان نہ کرتے اور نہ روسی مسلمانوں کو فریضۂ حج ادا کرنے کی اجازت ہوتی ؎

ستیہ ورت بیدی

فرائڈ اور اس کا بنیادی نظریہ

اس صدی میں یہودیوں کے خلاف جس وسیع اور عالمگیر پیمانے پر نفرت اور حقارت کا اظہار ہوا ہے۔ اس کی تاریخ میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ لیکن اس قوم کے تین افراد نے اس نفرت اور حقارت کا ایک انوکھا اور دلچسپ انتقام لیا ہے۔ مارکس، فرائڈ اور آئین سٹئین، ان تینوں نے انسانی تاریخ، تہذیب اور تخیّل کو ایک کایا پلٹ جھٹکا دیا ہے۔ گذشتہ چند صدیوں کی تاریخ کچھ اس طرح ہے جیسے برف کی ایک گیند لڑھکتے لڑھکتے ایک مہیب تودہ بن جائے۔ اور پھر اچانک، ایک پہاڑ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔ یہ کہنا ابھی مشکل ہے کہ اس کے منتشر ذرّوں کو کوئی دوبارہ جوڑ سکے گا یا نہیں۔

صنعت اور صنعتی انقلاب کے بعد مغربی تہذیب نے ایک عجیب بناوٹی انداز اختیار کر لیا۔ شہروں کی ترقی انسانی تاریخ میں ایک بالکل نیا واقعہ تھی۔ گاؤں سے شہر میں آنے والے امیر اور غریب دونو کے لئے دیہات کی آزاد فضا اور بیباختگی ایک خواب بن کر رہ گئی۔ کبوتر اور بلّی کی کہانی کی طرح انسان نے وحشی اور حیوانی امنگوں کی طرف سے آنکھیں موند لینے کی کوشش شروع کر دی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کسی عورت کے ٹخنوں تک کا ذکر کرنا بھی شرم کی بات سمجھا جانے لگا۔ گویا انسان نے نامرادی سے تنگ آ کر نامردی کو بھی اپنی قدروں میں شامل کر لیا ہے شرافت نامردی اور بے حسی کے مترادف بن گئی اور ایک شریف عورت کو خواہشات سے پاک اور احساسات سے منزہ سمجھا جانے لگا۔

اس بناوٹی پن کا جال جس طرح مضبوط ہوتا گیا اسی رفتار سے انسان داخلی تناؤ کا بھی زیادہ سے زیادہ شکار بننے لگا اور 'خبط' ہسٹیریا اور پاگل پن کے امراض عام ہونے لگے۔ انیسویں صدی میں ان امراض کا علاج ڈھونڈنا بھی ایک وبا کی شکل اختیار کر گیا۔ ہپناٹزم اور مسمریزم سب اسی وبا کی نشانیاں ہیں۔

اسی صدی کے اواخر میں ایک یہودی نوجوان اس وقت کے ایک مشہور و ممتاز ڈاکٹر شرکوٹ کے پاس ہپناٹزم کا علم سیکھنے گیا۔ ہسٹیریا کی ایک مریضہ کو دیکھتے ہوئے یکایک شرکوٹ کے منہ سے نکل گیا کہ ہسٹیریا کی ہر مریضہ کی جنسی زندگی میں کوئی نہ کوئی الجھن ضرور ہوتی ہے۔ یہ سن کر اس نوجوان کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے فوراً پوچھا "کیا ہمیشہ؟"۔ "ہاں ہمیشہ" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ڈاکٹر کے اس نوجوان شاگرد کا نام سیگمنڈ فرائڈ تھا۔ اس کا استاد بعد میں اگرچہ اس کلیئے سے خود منحرف ہو گیا۔ لیکن فرائڈ نے اسے نقطۂ آغاز بنا کر اپنی کھوج کا آغاز کر دیا۔

فرائڈ پہلا شخص تھا جس نے ہمیں جنسی خواہشات کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ بیشتر لوگ اسے ایک ماہر جنس ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ اس کی کھوج کا آغاز تھا انجام نہیں۔ پہلی جنگ عظیم سے پیشتر اس نے جو کچھ لکھا وہ جرمن زبان میں تھا۔ اس وقت لوگ قرون وسطیٰ کی تہذیب اور تمدن میں مدہوش تھے۔ جنگ عظیم نے ان کو پہلی بار جھنجھوڑا۔ جن مقاصد کے لئے جنگ لڑی گئی تھی لوگوں نے اپنی آنکھوں سے ان کا تمسخر اڑتے دیکھ لیا۔ اس وقت تک انسانیت اپنے تمدن پر بھروسہ کئے ایک تسکین دہ ماحول میں سو رہی تھی۔ اس بھروسے کو پہلی بار ایک دھکا سا لگا۔ مطمئن مغرب نے پہلے سوچا "کیا سچ؟" لیکن کیوں؟ اس بے اطمینانی اور شکوک کی فضا میں فرائڈ ہر دلعزیز ہو گیا اور عوام نے اس کی جنسی کھوج میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ صدیوں سے دبی ہوئی امنگیں پھر ابھر آئیں اور فرائڈ چٹخارے لے لے کر پڑھا جانے لگا۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اگر لوگوں کا علم فرائڈ کی ان کتابوں پر مبنی ہے جو اس نے پہلی جنگ عظیم سے قبل لکھیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ جنگ کے بعد اور اپنی موت سے پہلے اس کے نظریات میں کہیں زیادہ گہرائی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کی بعد از جنگ کی کتابوں سے استفادہ کئے بغیر اسے سائنٹیفک انداز میں سمجھنا ممکن نہیں۔ فرائڈ کے نزدیک

جنس صرف زندگی اور موت کی جدوجہد کا مظہر ہے۔ سائنس کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ کس طرح کائنات کے ارتقا میں ایک ایسا وقت آیا جب بے جان مادہ، مادہ حیات (Protoplasm) میں تبدیل ہوگیا۔ یہ مادۂ حیات کائنات کی حساس ترین شے ہے۔ معمولی سے معمولی چھیڑ چھاڑ بھی اس میں بے چینی پیدا کر دیتی ہے اور ہمارے عصبی نظام کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس چھیڑ چھاڑ پر کسی نہ کسی طرح قابو پا کر پھر موت کی نیند سو جائے۔ بیرونی چھیڑ چھاڑ کا حل ڈھونڈنا اگرچہ مشکل نہیں لیکن اندرونی اکساہٹوں کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ مختلف نمکیات کے عمل سے جسمانی اور نفسانی بھوک پیدا ہوتی ہے۔ اس کے پورا نہ ہونے سے اندرونی توازن بگڑ جاتا ہے اور ایک ناقابل برداشت بے چینی پیدا ہو جاتی ہے جو دراصل موت کا خوف ہے۔

عام لوگوں کے لئے اسے سمجھنا شاید مشکل ہو لیکن ہیگل اور مارکس کے طالب علم اگر فلسفۂ وجدانیات کی روشنی میں اسے دیکھیں تو بخوبی سمجھ جائیں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ جب ضدیں آپس میں ٹکراتی ہیں تو ایک نئے حل پر منتج ہوتی ہیں۔ کائنات کی تاریخ میں زندگی ایک طفل مکتب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ موت ہر وقت اس کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ جس کے مقابلہ میں زندگی اپنے آپ کو کمزور پاتی ہے۔ وہ ہر وقت موت کا مقابلہ کرتی ہے لیکن اسے اپنی شکست صاف طور پر نظر آتی ہے۔ صرف جنس ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے یہ موت کا جواب دے سکتی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہر انسان موت سے کہہ رہا ہے "دیکھو! میں تو مر رہا ہوں لیکن تمہارا مقابلہ کرنے کے لئے میں اپنی نسل چھوڑے جاتا ہوں"۔ اس طرح اولاد کی خواہش کے ایک بڑے سبب کا پتہ چل جاتا ہے۔ مسئلہ تناسخ اور قیامت کا یقین بھی دراصل موت کا ایک طفلانہ جواب ہیں۔

ہماری ہستی کی بنیاد زندگی اور موت کی جدوجہد ہے ان دونوں میں سے ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ نہ صرف اپنے حریف کا کامیاب مقابلہ ہی کرے بلکہ اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال بھی کرے۔ مثلاً جارحانہ کارروائی کا مقصد اگرچہ تباہی اور نیستی ہے لیکن زندگی اسے تعمیری کاموں کے لئے بھی استعمال کرتی ہے۔ ایک انقلابی اس کی بہترین مثال ہے۔ اسی طرح شیلے کی نظم خواہش تکمیل (Apoets-Longing for perfection) بھی موت کی ایک تعمیری خواہش کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ دوسری طرف موت زندگی کو مختلف حیلوں سے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہے۔ مثلاً ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں ہر جنسی ارتباط موت پر ہی ختم ہوتا تھا۔

۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد فرائڈ کو ایک نئی قسم کے مریضوں سے واسطہ پڑا۔ یہ مریض جنگ کے ہولناک مناظر دیکھ کر اپنا دماغی توازن کھو چکے تھے۔ اس سے پہلے فرائڈ ایذا طلبی کو ایک جنسی عارضہ سمجھتا تھا جو ایذا رسانی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ایذا رسانی بذات خود جنسی خواہشات پورا کرنے کا ایک مسخ شدہ طریقہ تھا۔ دماغی توازن کھو بیٹھنے والے (Shell Shock) کے مریض کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ بار بار خواب کے ذریعے اپنی ذات کو مبتلائے عذاب کرے۔ فرائڈ صرف اس مرض کے لئے نیا نام تجویز کر کے اس سے چھٹکارا پانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے جنس سے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور اسے اپنا پہلا نظریہ بدلنا پڑا جس کی رو سے ایذا طلبی ایذا رسانی کی ایک بگڑی ہوئی شکل تھی۔ اسے ایذا طلبی کو ایک الگ چیز ماننا پڑا جو موت کی خواہش کی ایک شکل تھی۔ اس طرح وہ (Shell Shock) کے مریضوں کی تھوڑی بہت مدد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

خاتمہ کلام سے پیشتر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ فرائڈ نے یہ کبھی نہیں کہا کہ اس کے وضع کردہ اصولوں سے آگے کھوج ممکن نہیں یا یہ کہ ان اصولوں سے زندگی کے تمام پہلوؤں کی تفسیر [illegible] ہے۔ فرائڈ کے قائم کردہ اصول نت نئے تجربات کی روشنی میں ہمیشہ بدلتے رہیں گے۔ اور اس کی کوئی بات حرف آخر نہیں کہلا سکتی۔

تصحیح جنوری کے پرچہ میں ایک مضمون "جارج برنارڈ شا" شائع ہوا تھا۔ کاتب کی سہو کے باعث مترجم کا نام غلط شائع ہوگیا ہے۔ صحیح نام سی۔ ایم۔ ایل۔ لانبہ ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

کمال احمد صدیقی

کھنڈر

اُفق میں گونجنے لگا ——
سیاہ اور مہیب بادلوں کا ایک کارواں !
فضائیں تھیں دُھواں دُھواں ،
گرج رہا تھا آسماں ،
کڑک رہی تھیں بجلیاں ——
میں کانپنے لگا — !!

نہ دیکھنے نہ سوچنے نہ فیصلے کا وقت تھا
بس ایک عزم اور ایک حوصلے کا وقت تھا
مگر یہ جسم ناتواں ——
میں ہانپنے لگا — !!

تھکے تھکے — بہت تھکے ہوئے تھے میرے ہات پاؤں
مگر تھی سامنے مرے حسین تجلیوں کی چھاؤں
افق سے تھوڑی دور مسکرا رہی تھی زندگی
اور اس پہ یہ شگفتگی ——
بس ایک عزم اور ایک حوصلے کا وقت تھا — !!

نقابِ صبح اٹھ گئی
مہک رہی تھی زندگی کی اک عروسِ نو بہار ،
دمک رہی تھی دور مشرقی اُفق میں روشنی ،
لہک رہا تھا سبزہ زار ،
چھلک رہی تھیں آب جو کی موج ہائے نغمہ بار
وُہیں کے پاس میری اگلی عظمتوں کی یادگار —— !

—— اور اُسپہ جھوٹی عظمتوں کا اک نشاں ——
"کہ نیلگوں سمندروں کی چیخ ، سُرخ ناگ ، ابر کی سفید دھاریاں"
—— کسی کی جھوٹی عظمتوں کا یہ نشاں ——
کھنڈر پہ توڑتا تھا دم کہ لے رہا تھا ہچکیاں — !!
ہوائیں خوشگوار تھیں ——
مرے لیے ۔
فضائیں شعلہ بار تھیں ——
مرے لئے ۔
وطن کی اگلی عظمتوں کی یادگار کے لئے !

سنہرا آفتاب لمحہ بھر میں سرخ ہو گیا
مہیب وقت ٹل گیا ،
ہوا کا اک تھپیڑا ——
اور اس میں ایک شعلہ ——
—— جھوٹی عظمتوں کا یہ نشان خود ہی جل گیا !
خود اپنی اگلی عظمتوں کی یادگار ——
یہ کھنڈر ——
اسے بھی توڑنا پڑا — !
خموش جھونپڑوں میں یہ کھنڈر بھی آج مل گیا — !!
سرودہائے نو بہار و رقص ہائے دلنواز
—— تھا زندگی کے ہات میں حیاتِ نو کا زمزم ساز — !
نئی امنگ دل میں تھی
نرالا ایک جوش تھا
تھا حوصلوں میں اک خروش

وہ "گومتی" کا جلترنگ
لئے نظارہ ہائے نو نے بھی رباب اور چنگ!
ہواؤں میں تھی تازگی،
فضاؤں میں تھی نغمگی،
حسین تر تھی زندگی، حسین تر تھی زندگی — !!

مگر —
ابھی تو ایک اور فکر تھی،
ابھی اک اور مسئلہ،
ابھی اک اور مرحلہ —
ہماری عظمتوں کے دو نئے نشاں — !
"خزاں، سفید ابر — اور بہار"
"زمردیں جھیل، اور اس میں عکسِ ماہِ نو — اور اسمیں قسمتوں کا اک حسین دیوتا"
ہماری عظمتوں کے یہ نئے نشاں ہیں کتنے اہم
یہ زرد، یہ سفید، سبز، سُرخ اور نیلے رنگ — !!! ؟

کلی

ثاقب کانپوری

جلوۂ صد نشاط ہے دائرۂ فضائے شب
خندہ زنی کی ہے تلاش تجھکو پسِ ردائے شب
رنگِ سکوت و خامشی غازۂ نو بہار ہے
دیدۂ نیم خواب کو صبح کا انتظار ہے
چاند کی ہے مجال کیا پردۂ رُخ اُٹھا سکے
برگ پہ ہو کرن کرن پھر بھی نہ تجھ کو پا سکے
زیرِ نقاب ہیں ابھی تیری شگوفہ کاریاں
لوٹ رہی ہے زیرِ شاخ برق کی شعلہ باریاں
لمحۂ پرسکوں میں ہے دور تری حیات کا
کہتے ہیں جس کو پنکھڑی پردہ ہے کائنات کا
صبح کا راگ کیا سُنا نیند اُچٹ کے رہ گئی
برگ سمٹ کے رہ گئے، شرم لپٹ کے رہ گئی
شاخ کی سبز پتیاں، تیری بلائیں لے چلیں
کونپلیں پھوٹ پھوٹ کر، تجھکو دعائیں دے چلیں
پردۂ پُر حجاب پر صدقے ہے پاک دامنی
چھو نہ سکی ترا بدن، صبحِ ازل کی روشنی

عرصہ گہِ شگفتگی زندہ کُنِ بہار ہے
کیا تری مٹھیوں میں بند صحتِ خوشگوار ہے

خاطرؔ غزنوی

مرے دوست

مرے بھٹکے ہوئے دوست

تیرے ان سلجھے ہوئے بالوں میں

لاکھ انسانوں کو اُلجھا ہوا پایا میں نے

ایسے افسانے —

جو رنگین بھی ہیں

ایسے افسانے جو رنگین بھی ہیں دلچسپ بھی ہیں۔

ایسے افسانے جو رنگیں بھی ہیں دلچسپ بھی پر درد بھی ہیں

ایسے افسانے جو رنگیں نہیں پر درد نہیں۔

ایسے افسانے جنہیں سن کے مجھے گھن آئی

ایسے افسانے جنہیں سن کے مجھے رحم آیا

ایسے افسانے جنہیں سن کے مجھے رشک آیا۔ تیری بے لوث محبت کی قسم

ایسے افسانے جنہیں جذب کیا

غم و غصّہ نے مرے

میرا ماتھا شکن آلود ہوا

اور پھر کھو گئی ہر ایک شکن

تیری ان آنکھوں کے چمکے ہوئے مئے خانوں میں

تیرے ہونٹوں کی چھلکتی ہوئی رنگینی میں

یہ ترے ہونٹ —

تیرے ہونٹوں سے چھلکتی ہوئی مے

کیا انہیں اور کوئی چیز بھی مرغوب نہیں — ؟

یہ سلگتے ہوئے ہونٹ —

کیا انہیں آگ ہی دنیا میں پسند آئی ہے —؟

کیا سلگتی ہی رہے گی یہ جوانی تیری — ؟

کیا ہمیشہ کے لئے تجھ کو یونہی رہنا ہے — ؟

کیا فسانے ہی سنوں گا میں مدام — ؟

ایسے افسانے جو رنگین نہیں پر درد نہیں —

ایسے افسانے جنہیں سن کے مجھے گھن آئی

میرے بھٹکے ہوئے دوست

”سوچتا ہوں کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں“

غزل

قتیل شفائی

پربت پربت گھوم چکا ہوں صحرا صحرا چھان رہا ہوں
ہر منزل کے حق میں لیکن کافر کا ایمان رہا ہوں

تیرے در پر عمر کٹی ہے پھر بھی کیا انجان رہا ہوں
دنیا بھر کے سجدوں میں اپنے سجدے پہچان رہا ہوں

مصلحتاً اس دنیا پر بھی دل نے بھروسہ کر ہی لیا تھا
ایک تمہاری کھوج میں جانے کس کس کا مہمان رہا ہوں

دور سنہرے گنبد چمکے لیکن گردن کون جھکائے
میں تو جنت بھی کھو کر آزاد منش انسان رہا ہوں

گردشِ دوراں کے لب پر لے دے کے غم کا سندیسہ ہوگا
ایسے کتنے افسانے ہیں جن کا میں عنوان رہا ہوں

ہائے مری مجبور جوانی، وائے مری ناکام محبت!
گھائل کی فریاد رہا ہوں، مفلس کا ارمان رہا ہوں

دیکھ مری انمول شرافت، لُٹ بھی گیا شرمندہ بھی ہوں
جیت بھی لی اخلاص کی بازی ہار بھی اپنی مان رہا ہوں

پھر تم نے مجھے بُلایا

عبدالمجید بھٹی

مہکے پھول اور تارے جاگے
سندر پریم سہارے جاگے
کن کن میں البیلی آشا جھوم اٹھی لہرا گئی
پھر تم نے مجھے بُلایا

رات سہانی پون جھکورے
مدھ ماتے نینوں میں ڈورے
بے کل من اک چنچل نگری جگ پر مستی چھا گئی
پھر تم نے مجھے بُلایا

گھور گھور کر مت مسکاؤ
جاؤ اب تم جاؤ جاؤ
نینوں میں نیناں مت ڈالو دیکھو میں شرما گئی
پھر تم نے مجھے بُلایا

احمد ندیم قاسمی

انجام

— مرے ندیم! بس اتنی ہی تھی حکایتِ شوق
تصوّرات لُٹے، وہ لُٹے، حیات لُٹی
مجھے لبھا نہ سکیں دوسروں کی قندیلیں
مرا چراغ بجھا — ساری کائنات لُٹی

تسلّیوں کے کھلونے نظر فریب تو ہیں
مگر شکست کا عرفان ہو چکا ہے مجھے
مرے افق پہ نہ برسا تبسّموں کی پھوار
کہ مدّتوں مرا انجام رو چکا ہے مجھے

کئی نجوم کو پیسا گیا تو چاند ڈھلا
مگر یہ تیری نظر میں بلند پایہ ہے
میں چاندنی سے تو مانوس ہو چلوں گا۔ مگر
مجھے بتا کہ یہ سایہ کہاں سے آیا ہے!

میں ان سسکتی ہوئی ظلمتوں میں جی لوں گا
کہ انقلابِ مسلسل سے بے نیاز ہیں یہ
یہ آنسوؤں کے شرارے؟ یہ گھومتے تارے؟
انہیں نہ چھیڑ، کہ میرے عزیز راز ہیں یہ

ابوالفضل صدیقی

ملکیت

افراط

بے تمیا کے پرسے، بے بھادوں کے برسے پیٹ نہیں بھرتا۔ ساری دنیا چیخ اٹھی۔ ہری کھیتیاں چرمرا کر رہ گئیں۔ ساون کھلے اور ایسے کھلے کہ کورے اتر گئے۔ خیر مکا، ساٹھی، سما، کنگنی چٹنی ہو گئی تو کسان کی نظر دھان پر لگ گئی۔ مگر ساون دانت دکھا گیا تو دکھا گیا تھا کمبخت پورے دو نکہت بھادوں بھی کھل گیا۔ پہلے نکہت کے کھلتے ہی دھان سے نگاہ ہٹا کر غریب کسان جوار باجرا اور مونگ کی امید پر قانع ہو گیا مگر دوسرے نکہت کے کھلتے ہی تو اک قیامت برپا ہو گئی۔ پوری کی پوری دونوں فصلیں جل بھن کر جہاں کی تہاں رہ گئیں زائد تو درکنار فصل خریف ہی ختم ہو گئی نہ مکا ساٹھی دھان رہا اور نہ جوار باجرا اُردہی۔ چارے میں قبل از وقت کھل جانے کیوجہ سے سونڑی پیدا ہو جانا لازمی تھی جس کا پتہ ہمیشہ غریب کسان کو عملی تجربہ بھگت کر چلتا ہے یہ چارہ کھا کر مویشیوں میں مر پڑ گیا۔ اور وبا سے جو کچھ بچے وہ تُچ تُچ کر بھوکوں مرنے لگے ہتھنی سی بھینسوں کا دودھ خشک ہو گیا۔ پکھاڑا سے بیلوں کے پاؤں ٹوٹ گئے۔ انڈا سے چکنے چوپڑے بچھڑے گائیں بکریں سوکھ سوکھ کر پنجر لگ لگ کر قصائی کے کھونٹے پر جا کٹے۔ اب برسات کی دو نکہتیں اور باقی تھیں اور رہی سہی فصل ربیع کا دارو مدار انہیں دونوں نکہتوں پر تھا مگر آسمان بیچ کھیت دیدے دکھا رہا تھا۔ ہر وقت خشک کھڑ بنڈا پچھاؤ سنناتا۔ صبح مشرق سے جلتا بھنتا نکل کر شام تک جلتا ہی بھنتا سورج اپنی تیز سیدھی کرنوں کی کمندیں کرۂ ارض پر پھینکتا ہی رہتا اور مغرب تک مختلف زاویوں سے پھینکتا ہی پھینکتا ہر ہر جلوے دن دہاڑے کشت دہقان لوٹتا ہوا دوش ہوا پر اپنی جھلسا دینے والی کرنیں سوار کر کے اندر دیوتا کے امساک کے ہاتھ کی دی ہوئی تری چاٹتا، نئی نئی آتش زندگیاں کرتا رہتا اور اس کے ڈسے ہوئے لاتعداد نونہال جہاں کے تہاں سر جھکائے شام کو دائمی نیند سو کر رہ جاتے۔ ع "ہر جگر بھنتا ہوا ہر کھوپڑی پکتی ہوئی" کا شکار وسط جولائی سے وسط اگست تک رفتہ رفتہ ایک مسلسل موت کی صورت اپنا خزانہ دن دہاڑے آنکھوں سامنے لٹتے دیکھ کر سانپ کے بل لے لے کر رہ رہ گئے۔ اور اب جبکہ ربیع کے جتے جتائے طیار کھیتوں کی جان نکلنے لگی اور یہ تین مہینے کی کری کرائی محنت بھی مٹی میں ملتی دکھائی دی اور تاریک مستقبل کی جیتی جاگتی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی تو وہ ماضی کے افسوس اور حال کی پریشانی کے احساسات سے باہر ہو گئے۔ اور ان کی نظر نہ تو اپنی خالی کٹھیوں پر رہی اور نہ انہیں اب اپنی سوکھی چرمرائی کھڑکھڑاتی خریفوں ہی کی آوازیں سنائی دیں، بس ان کی رحم کی بھیک ہی طلب کرتی متوحش آنکھیں اپنے تابناسے تپتے ہوئے ربیع کے دم توڑنے کھیتوں پر مرکوز ہو کر رہ گئیں، جن کی روح کھنچ رہی تھی، اور وہ خوب سمجھ رہے تھے کہ ان میں تخم ریزی کی نوبت بھی نہیں آئے گی۔ تا حدِ نظر سینہ چری ہوئی زمین کو جس کی مٹی میں ان کے پسینے کی کارفرمائی لالہ و گل بن کر چمکنے والی تھی خشک و بے روح دیکھ کر پیٹ پٹک پٹک کر ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کر رہ جاتے۔ شفاف سے نیلے آسمان کی جانب نگاہیں اٹھاتے اور "اندر دیوتا سوئے گئے" بڑبڑا کر مجبوری و بیکسی کا مرقع بنے رہ جاتے۔

ربیع کی پیداوار کا اناج تو کسی تقدیر کے سکندر کاشتکار کے گھر میں بھادوں تک رہ جاتا ہو تو رہ جاتا ہو ورنہ بالعموم "بیج بیوہار، کھاد خوراک" "پوتا پائی" "نبٹتے نبٹاتے کھڑے کھیت تھوڑی بہت "اردن دھروں" ہی کھا پڑیں تو بڑی بات ہے ورنہ پھر شروع سال ہی سے ساہوکار کھلانا شروع کر دیتا ہے۔ اور ڈھائی تین مہینہ میں بھدیاں ناج پکڑوا دیتا ہے۔ اب بھلا بھدیاں ناج تو درکنار کنکیا ناج بھی جو کچھ تھا آگے آ گیا تھا اور اب اس سے بھی بڑھ کر ربیع کا سمت بھی آنکھیں ہی دکھا رہا تھا اور دو نکہت میں سب کچھ معلوم ہوا جا رہا تھا۔ ہوا کا رخ اور آسمان کا رنگ سامنے تھا۔ اونچے اور

ریتیلے اور نیچے مٹیار کھیت تو جواب دے چکے تھے۔ ترائیوں اور دومٹ میں خال خال اوس کے سہارے ہل چلتے دکھائی دیتے، سو وہ بھی دھینگتی سے، بانس بھر دن چڑھتے ہی جہاں ذرا اوس خشک ہوئی اور پہاے گھر گھرا نکلے، دھوآں اڑنے لگی اور دوپہری میں تو کیا اونچا کیا نیچا سب ہی زمین کی جان نکل جاتی، چلچلاتی دھوپ میں گیس کی لہریں قافلے در قافلے چلنے لگتیں، تمام جنگل میں ریلیں سی دوڑتیں، دھول کے پھندے بنتے، اور زمین سے لیکر آسمان تک اٹھے ہوئے بگولوں کے رواں دواں ستونوں سے جنگل ہلنے سا لگتا۔ اور یہ گرمی اور گرد کے زائیدہ، کسانوں کی آہوں کے دھوئیں تمام جنگل پر چلتی ہوئی بھوتوں کی ٹولیوں کی صورت چھا جاتے اور دن دوپہر سارا جنگل مردہ حرکتوں سے رقصاں سا نظر آتا —— اچھی خاصی برسات کی چاندنی رات آتی۔ شام کا صاف نکھرتا ہوا نیلگوں آسمان یکدم چاند کی روشنی سے چمک اٹھتا اور وہی ہوا ہُو۔ ہو۔ آ۔ ہو۔ ہو ہو ہو بھیانک خشک پچھاؤ ڈونکتا اور سہانے منظر پر پُرہول سناٹا طاری ہو جاتا۔ گاؤں کے بچے دن چھپنے سے پہلے ہی جیسے ایک نامعلوم سے خوف سے متاثر ہو کر گھروں میں گھس جاتے — چوپالوں پر سرِشام ہی سے مران سی پڑ جاتی، نہ آلہا اودل کی بہادری کے گیت اور جنگ کے رجز ہوتے اور نہ ہیر رانجھا کے عشق اور رومان کے راگ سنائی دیتے۔ ڈھول گھڑے اور تمبور سب کونوں میں منہ دیئے ٹوٹے پھوٹے پڑے ہوتے اور منچلے نوجوان کسان ادھر ادھر اندھیری چوپالوں پر چادروں میں مونہہ لپیٹے چپ چاپ سانس لیتے مردوں کی طرح پڑے ہوتے گھروں کے اندر سے نہ ملہاریں بلند ہوتیں اور نہ ڈھولا بجتا، بس دن چھپتے چھپتے تمام دیہات میں مران سی پڑ جاتی اور گانوں گانوں "ناہر سا لگنے لگتا"۔

بنجوں اور سلونوں جیسے شوخ اور ہنگامہ آفریں تیوہار آئے اور ایسے چپکے سے نکل گئے کہ کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی چپکے سے چند دیہاتی لڑکیاں کچھ مرجھائے سے پھول اور کچھ پیلے پیلے سے جمے ہوئے جگمگاڈیوٹ اوندھے تالاب پر چڑھا گئیں نہ پوری پکوان اور سوئیاں ہوئیں اور نہ گانا بجانا جھولنا ——

بھوک کی وبا! ساری دنیا پر! سے پھر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

کوئی امید بر نہیں آتی —— آسمان پر صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک مجال کیا جو ایک بادل کا ذرا سا پھلپہ بھی ادھر سے ادھر دوڑتا ہوا نظر آ تو جائے —— میکائیل اپنا چارج عزرائیل کو دیتے نظر آ رہے تھے ——

(۲)

رام نگر کی اکثر چوپالوں پر تو دن چھپتے ہی اُلّو سا بول جاتا اور اکثروں پر تو چراغ بھی نہ جلتا۔ آدھے چہارم پیٹ جو کچھ جسے مل گئی کھا پڑا مگر بڑی چوپال پر اب بھی جوان بوڑھے منچلے جمع ہو لیتے تھے اور اپنی دکھ درد کی الٹ پلٹ ہو جاتی تھیں اور آدھ سیر تین پاؤ تمباکو اور دس پانچ اپلے جل جاتے تھے۔

بوڑھے مکھیا نے جلدی جلدی چلم پر دو تین اخیر کش لگائے۔ اور پھر لڑکے کی جانب بڑھا کر کہا۔ "لے ذرا آگ رکھ لا۔ اس پہ ڈانٹ کے تمباکو رکھیئے"۔ اور پھر دوسرے پلنگ پر بیٹھے ہوئے آدمی سے اپنا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "اب جیسے دو نکھتیں اور رہ گئیں پورباؔ، اُترّاؔ بس پھر ہست اور چیت چنا گیہوں کی بونی کی نکھت ہیں، اگر پانی ناہیں برسا تو ربّی (ربیع) ناہیں بیجنگی —— مکا، ساٹھی، جوار باجرا دونوں پھسلیں (فصلیں) سلپھا ہو گئیں۔ اب معلوم ہویت ہے کہ ربیوں (ربیعوں) کے کھیتوں میں نچاس ترائی دو ایک دن ہل چلت ہیں پھر بند ہو جائیں گے"۔

"بند ہو جائیں گے مکھیا کہ بند ہو گئے؟ —— سب کھیت سوکھ گئے۔ پھر ٹھلوا سے بیگار بھی لونڈے چھک باروں (پہر بھر دن چڑھے) تک پھیرے پھیرتے راہیں ہیں۔ نیک (ذرا)، ہاتھ پانوں پھر برے ہو جات ہیں"۔ اور جوت جات کا ہے کی ہے بھلا؟"

"تو پھر اب لونڈے ہاتھ پانوں پھریرے کرتے راہنگے اور کھانگے کیا چبکا کے ڈھیلے؟"

"ٹھیک ہے لمبردار —— کا ہو ساہوکار بیوہرا کے در پہ جاؤ گے تو روپیہ کا مال پہلے تک لیئے گو تو سولہ آنہ جانچ کے جوانی پکڑا بے گو کھونٹی ——"

"ہاں جی بھلا بولو تو مکھیا جب کھیت رہتے (خالی) پڑے ہونگے۔

تو ہمرا ساہوکار دکھبا کیا دیکھ کے کھلائے دیئے گو کیا لنگوٹی پہ رکم (رقم) تھمائے دیئے گو "

" ارے جب بیا کھی چاروں کھونٹ بھری ٹھاڑی دیکھ لیئے گو تو ہیونت ہیونت (جاڑوں جاڑوں) آدھے تہائی پیٹ کھلائے دیئے گو"

"تو ایسے تو بیا کھی ٹھاڑی (کھڑی) ہونگی نائے کر دکچھ چنتا "

" چنتا! ارے مکھیا چنتا!! بڑھئو جیسے کچھ اپنے ہاتھ کی بات ہے اب جیسے آسمان پھاٹ گئو کا ہو کو بس جا میں ہے"

"ہوں! بس ناہیں اور کہا!"

"ایں ؟!"

"کہا بس بڑھئو! ؟ "

" راج ہل کرائے دیو اپنے ہاتھ کی بات ناہیں تو اور کیا اب جیسے بلدیو بیٹھے ہیں ان سے گنگا جلی دھر کے پوچھو پارسال بڑے راجکنوار سکار کی دوڑ میں تھے ڈیرہ لاگے تھے بنجر پہ ہم نے اور بلدیو نے اور جگھن نے ایک ایک دھڑی گیہوں ان کے سکاری کو دیدیئے تھے کہ مہاراج کنوار کا پاؤں ہمارے کھیت میں ڈلائے دیئے سکارے (صبح) چالیسا چنر پال جنت ہو ہیں مینڈھ پہ چلم پیت ہو اور سرکار دور سے آتے دیکھے ڈونڈیا سکاری آگے آگے رستہ بنات آت ہو اور میں نے جگھن کو ٹیر (پکار) ماری اور جھگن نے بلدیو کو سرکار میرے جا بسا میں ہوتے جگھن کے بیا میں پڑیئے اور پھر بلدیو کے بتیا میں سے نکلے وڑے پہ پڑیئے ہم تینوں پیچھے پیچھے لاگ گئے وڑے (شاہراہ) پہ سائیس گھوڑی لیئے کھڑا تھا ہم تینوں نے سلام کرکے چرن چھوئے اور سرکار نے ابڑھ دئی برچھی تھامی اور کنٹری میں سور کھیدیں کے لیئیں چل دیئے اب بھیا بلدیو بولو تمہیں گنگا ماتھے۔ بولت کیوں ناہیں بھیا جگھن بڑی جارت (زیارت) کی کسم ہون (پیداوار) کیسی رہی

" ارے مکھیا سات پیڑی کو دلدر پھٹ گئو"

"گھر بھر گئو گھر مارے گیہوں کے مارے"

سو ہم کہت ہیں راج ہل کرائے دیو ایسو ہی مجا (مزہ) آئے کے نائے رہ جائیں تو ہم ہاتھ کٹائے دیں"

" جے تو ٹھیک ہے پھر آج کل مکھیا کہا گروہ ہے ؟ "

گروے کی اس میں کیا بات ہے جس کے پاس ہے نکالو جس کے پاس ناہیں ہے بو کٹو ساہوکار کو ٹٹولو دس دس سیر گیہوں ہل پیچھے اکھٹے کر لیئو اور راج ہل ہم کرائے دئیں

" تھوڑا بہت کسی ڈبیا والے مجوروں (مزدوروں) پہ ڈال دیو سب مل کے اٹھائیں تو چھپرا اٹھ جات ہے "

نوجوانوں نے دونوں بڑھوں کی باتوں کو تعجب اور جیسے کچھ مضحکہ کے انداز سے سنا اور ایک بولا " ارے بڑھئو اب بھلا اتنی گھیر گھار کیسے کرے گی "

" ارے لونڈو کام ہمت کے بل پہ ہوت ہے ہم تمہاری عمر میں تھے تو جے تو راج ہل ہے پہاڑ کے پتھر ڈھون کی ہمت تھی "

" اور اب کیا ہے پورکھ ناہیں رہے اور بھیا لاٹ کو بڑی رانی تو نو ہجار من ناج سے کم میں ناہیں نکال ملیں گی "

" کہا بڑی بات ہے اتنا بڑا الاکھا (علاقہ) ہے چھوٹی گنگا کی ترائی سے بڑی گنگا کے کھادر تک سب مل کے چاہئیں تو کیا بڑی رانی نائے نکل سکت ہیں "

" ارے اب آدمی بہت سوم ہو گئو ہم نے دو تین پوت (مرتبہ) راج ہل کرائے "

" جو بھیلی ناہیں گنا دیدیئے گو بو دوہ) راج ہل کرائے دیئے گو پھر آج مت دیو گنا کل ہی کو بھیلی دیئے گو"

کون بڑی بات ہے جا بیرا (اس وقت) دس دس سیر ناہیں نکالو گے تو پھر آگے کیا گھنٹا رے لیئو گے اور بڑی رانی بدوں (بغیر) اندر مہاراج (کروٹ لیتے دکھائی نہیں دیتے) اب لیت ناہیں دکھائی دیت کہ دیت "

" کرو بھیا کل اکٹھ "

" آپ کریئو ڈنڈا کے بل بندری ناچت ہے "

" ہاں مکھیا روگ بیدھن کال پڑت ہے تو آدمی بھگتت ہے "

" ارے لونڈو راجہ رانی بھگوان کا برن ہیں ہاتھ پل پہ دھرت کھن (رکھتے ہی) اندر مہاراج کو لاج آئے گی "

ہاں توکل کی بیٹھ منادی کرائے دیو کہ اگلی بیٹھ دو دھڑی گیہوں ہل پیچھے باندھ کے آئیں۔ کیا مجور کیا جوتا کوئی رہتا (خالی) نہ آوے بڑی رانی ہل تھامنگی۔"

رام نگر جاگیر کا صدر مقام تھا۔ یہاں شکار کے سلسلے میں کبھی کبھی سرکار راجہ صاحب بہادر اور راجکنوار صاحبان بھی تشریف لاتے تھے اور نئے اور پرانے رسم ورواج میں یہاں کے نکلے ہوئے قوانین دوسرے مواضعات کے لئے نظیر ہوتے تھے اور جس قانون کا نفاذ اس موقع پہ ہو جاتا تھا۔ اس کو راجہ صاحب کی تمام جاگیر بخوشی منظور کر لیتی تھی۔

(۳)

قطرہ قطرہ دریا بن چکا تھا۔ اور دریا چاروں طرف سے امنڈ امنڈ کر سمندر کی شکل اختیار کر رہے تھے۔" جادوئے محمود کی تاثیر سے پورے زور کے ساتھ چشم ایاز مسحور تھی۔ راجہ ابن الزماں صاحب بہادر کی شاندار محلسرا کے پھاٹک کے سامنے وسیع میدان میں شور قیامت برپا ہو رہا تھا۔ کاشتکار عورتوں کے غول جوق در جوق چاروں طرف سے امنڈے چلے آ رہے تھے۔ "نو من تیل جمع ہو گیا تھا۔ رادھا کے ناچنے کا مطالبہ تھا۔" گاؤں گاؤں کی عورتیں بھانت بھانت کی آوازوں میں ڈھول پر مخصوص روایاتی گیت گاتی چلی آ رہی تھیں۔ جن میں قحط پڑ جانے کی شکایت اور رانی سے ہل جوتنے کا مطالبہ تھا۔ محلسرا کے سامنے کا وسیع میدان، ارد گرد کی تمام شاہراہیں، پائیں باغ کا چپہ چپہ اور قرب وجوار کے کھیت سب عورتوں سے بھر گئے تھے ڈھول اور گانے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ٹولیاں کی ٹولیاں وہی مخصوص تاریخی روایتی گیت گا رہی تھیں۔ ڈھول کی آواز کے ساتھ ہزاروں عورتوں کے گانے کا شور آسمان کی خبر لا رہا تھا۔ مجمع کے بیچوں بیچ سر برآوردہ دیہاتی عورتوں کے ساتھ بڑی اونچی ہریانہ نسل کی بیلوں کی شائستہ جٹ کھڑی تھی۔ سروں پر ریشمیں ہری پگڑیاں، گلوں میں گنگا جمنی سونے چاندی کے گھنگھرو۔ پیچھے ہل جس میں سونے کا مٹھیا اور سونے چاندی کا گنگا جمنی پھالا لگا ہوا منتظر تھی۔

محلسرا کی مشینی نظام جیسی چہل پہل میں اس شور قیامت سے کچھ تھوڑی سی ابتری پیدا ہوئی مہاراج کنوار بہادر چھوٹے دیوان خانہ کے صحن میں نوجوان گرے ہاؤنڈ پلّوں کے سامنے خرگوش چھوڑ چھوڑ کر انہیں مونہہ مارنے کی تعلیم دے رہے تھے اور ہر پلّے کے منہ میں خرگوش دبائے پر یارانِ طریقت کے قہقہوں سے تمام دیوان خانہ کی فضا گونج جاتی تھی۔ پلّوں نے اپنی توجہ کچھ باہر کے شور کی جانب کی اور بھونکنے لگے اور اپنے شکاری مشغلے سے کچھ ہٹنے سے لگے مہاراج کنوار نے کچھ جھنجھلا کر کہا "یہ کیا قیامت ہے الاماں —"

سرکار مینہ نہیں برسا ہے تمام علاقہ کی عورتیں جمع ہو کر آئی ہیں بڑی رانی صاحبہ کو راج ہل کے لئے بلا رہی ہیں"۔

"ایں مینہ نہیں برسا — کب؟"

"بس یہی سرکار آج کل"

"اچھا برسات ہے؟ اکب سے؟"

"بس سرکار یہ آدھے بھادوں سے پانچ دن اوپر گئے"۔

"بھادوں کیا؟"

"برسات کا مہینہ — جس میں مینہ نہ برسے تو کچھ پیداوار نہیں ہوتی"۔

"پیداوار — کیا پیداوار"

"ناج غلہ — گھاس پات"

"اور یہ بڑی رانی صاحبہ کو کیوں بلا رہی ہیں۔"

اماں بنادہ بھی سب مزہ کِر کرا کر دیا۔ اچھی پیداوار ہوئی۔ تمام پلّے گھبرا گئے۔ چلو ادھر نکل چلیں پھواڑے والے صحن میں — ایک مصاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ اور کتوں کی ڈوریں تھامے خرگوشوں کی کنڈیاں دبائے خدام مہاراج کنوار اور ان کے مصاحبین کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

منجھلے راجکنوار بیچارے بہت پریشان تھے۔ انہوں نے آج زنخوں کا گانا کرایا تھا۔ اندر ان کی پوری چھ کی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور دروازے پر یہ قیامت برپا تھی۔ انہوں نے اپنے نو عمر عورت اور مرد کے درمیان کچھ "عالم برزخ" والی قسم کے مخصوص ملازم سے دریافت کیا۔ "ارے ہنی دیکھو تو ذرا یہ کیا غدر مچا رکھا ہے ان جنگلیوں نے؟ کیوں آئے ہیں ہولی نہیں عید نہیں پھر آج کیا ہے؟"

"اے ہے سرکار خدا جھوٹ نہ بلوائے تو آج موئی خصم پٹیاں سب علاقہ بھر کی یہیں جو جمع ہیں اور شور مچا رہی ہیں کہ بڑی رانی صاحبہ ذرا نکل کر ہل جوت دیں تو مینہ برس پڑے۔ قحط پڑ گیا ہے۔ سرکار قربان جاؤں

قحط، سو آئی ہیں گاتی بجاتی"

"ایں! تو کیا یہ عورتیں ہیں سب کی سب؟!"

"ہاں میاں نری عورتیں ہیں نگوڑیاں۔"

"اجی درباں نے مار نہیں بھگایا؟"

"اے حضور عرض کیا نا میں نے سونے چاندی کا ہل بیل لائی ہیں نذرانہ میں نگوڑی، جھاڑ و پھیروں — سو مردیوں نے اودھم جوت دیا ہے - اندر سے باہر تک کان پڑی سنائی نہیں دیتی۔ اے ہے مجھ بندی کے تو کان ہی پھوٹ گئے اوئی! —" دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں سے شور کی سمت اشارہ کرکے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ — بھلا آج ہی کم بخت قحط بھی پڑنے کو رہ گیا تھا۔" راجکنوآر نے اپنی زنخوں کی چوکی کی جانب دیکھ کر کہا۔ جن کی صورتوں ہی سے گویا نغمے پھوٹے پڑتے تھے۔ اور پھر لاچار سے ہو گئے اور کچھ دیر ٹھہر کر بولے۔" دیکھو تو منی — تیسری منزل پر تو پناہ ملے گی ان کے شور سے گھڑی بھر کو؟ دو بول سن لیں"۔

اے ہے قربان جاؤں سرکار کیا عرض کروں تیسری منزل تو درکنار آج تو اندر تک ساری حرم سرا باہر چھوٹا بڑا دیوان خانہ ان آوتی غضب ماریوں کے شور سے سب ہی ہاہا بادہو رہا ہے پھر کیا عرض کروں حضور اوپر ہی تشریف لے چلیں"۔ اور راجکنوآر کی پوری چوکی اور راجکنوار منی ملازم کی قیادت میں اپنا اپنا ساز باز سنبھالے زینے پر چڑھ گئے۔

چھوٹے راجکنوآر غصے کے مارے لال تال تھے۔ ان کا بس نہ تھا کہ اس وحشتوں کے غول پر آج توپ داغ دیں۔ آج سہ پہر کو ان کی پالی تھی مگر شور سنکر ان کے سب پرند پنجروں اور ٹاپوں میں گھبرا رہے تھے۔ اس وقت" اصیل کا جادا" ان کے سامنے تھا۔ زعفران اور بادام کے گوٹے اپنے ہاتھ سے کھلا رہے تھے۔ شور سنکر مرغا کڑکڑا کر پھڑا بٹیریں اور بلبلیں اچھلنے لگیں ۔" بس ساری پالی کا ناس لگ گیا۔ سب پرند ڈر گئے۔ اب کیا خاک لڑیں گے"۔ ملازموں نے جلدی جلدی بدحواسی میں بٹیروں کے پنجرے اور بلبلوں کے اڈے اندر کوٹھڑیوں میں بند کرنا شروع کئے۔ مرغوں کے ٹاپے دوسری جانب کو لے گئے۔ راجکنوآر نے کہا۔ "ارے صاحب پھر آج تو بدا ہوا دن ہے، یہ نام ہوگا کہ بہانہ کر کے میدان چھوڑ گئے۔ چلو عقب والے صحن میں سب چڑیوں کو لے کر نکل چلیں۔ اور کچھ نہیں تو دو مرغے تو طیار کر ہی لیں۔ آج کی پالی کے لئے چار لاتیں تو ہو ہی جائیں۔

چند ملازمین نے بٹیروں کے پنجرے لئے۔ کچھ نے مرغے بغل میں دبائے ہاتھوں میں ٹاپے لٹکائے اور کسی نے بلبلوں کے اڈے پکڑے اور پچھواڑے والے صحن کی پناہ گاہ کی جانب چلے۔ وہاں خرگوشوں کے اور کتوں کے بچوں کے دانتوں پر سان رکھی جا رہی تھی۔ بس دیکھ کر الٹے پاؤں پلٹ پڑے نہیں تو پرند مہینہ بھر کے لئے جی چھوڑ جاتے اور غصے کے مارے قحطوؤں کے شور کی جانب مٹھیوں میں بٹیروں کو پکڑے ہوئے گھونسا تان کر دانت کٹکٹا کر رہ گئے۔

راجہ صاحب عین صدر پھاٹک کے اوپر تاج والے بالاخانہ پر تھے۔ انہیں اس کی اطلاع مل چکی تھی۔ مگر تین روز سے شطرنج کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ انہیں کھانے پینے کا ہوش بھی نہ تھا۔ اور نہ بچارے کو تن بدن کی ہی خبر تھی۔ شور سنکر انہوں نے بساط سے نظر ہٹائی اور بولے" اونہہ، اونہہ، چہ چہ چہ توبہ، آج کی چال اس قیامت کی نذر ہو گئی۔ بس دماغ منتشر ہو گیا۔ سارا سلسلہ ٹوٹ گیا ارے کوئی ہے ہے" فوراً ایک ملازم ظاہر ہو گیا۔ راجہ صاحب نے بساط پر نظر جمائے ہی جمائے بغیر ملازم کو دیکھے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا اور کہا۔" ارے بڑی رانی صاحبہ کو اطلاع کرا دو کہ اک ذرا نکل آئیں اور کہیں ادھر ادھر جا کر اک ذرا ہاتھ لگا دیں۔"

ملازم نے جواب دیا۔" سرکار وہ تو کل شام ہی مینجر صاحب کے پاس حضور بڑی رانی صاحبہ نے جواب بھجوا دیا تھا کہ وہ صبح نہ جا سکیں گی۔ بلاسو کی طبیعت ناساز ہے"۔

" ایں بلاسو کی طبیعت خراب ہے؟ تو پھر ڈاکٹر کو بلا کر دکھا دیا ہوتا۔"

جی سرکار کل قصبہ کے ہسپتال کا ڈاکٹر آیا۔ اس نے کچھ دوا دی اس سے طبیعت صحیح نہیں ہوئی تو سہ پہر کو شہر کار بھیجی مغرب کے قریب ڈاکٹر آیا ایک انجکشن بھی لگا گیا جب سے خیر سے کچھ طبیعت سنبھلی ہے۔

" ہوا کیا؟" راجہ صاحب نے بساط پر سر جھکائے ہی جھکائے کہا۔

" سنا ہے پرسوں دن میں کچھ سست ہو گئی دودھ بھی نہیں پیا اور

گوشت بھی سونگھ کر چھوڑ دیا۔ بس سرکار رانی صاحبہ کو کچھ زیادہ فکر نہیں ہوئی۔ یوں بھی ہفتہ عشرہ میں ایک دو مرتبہ کھانا پینا چھوڑ دیتی تھی۔ مگر پرسوں ہی رات میں کوئی آوارہ بلی حرم سرا میں کدھر ہی سے آگئی اور وہ لڑ گئی۔ رات میں شور پر کسی کی آنکھ نہ کھلی اور معلوم ہوتا ہے کہ صبح تک خوب ہی لڑائی ہوئی اور ساری رات اس آوارہ بلی نے بلاسو کو دے دے پٹخا۔ منّو اور پسو آپ بڑی راجکنواری صاحبہ اور منجھلی دولہن صاحبہ کے بستروں پر بے خبر سو رہی تھیں ورنہ وہ شاید کچھ مدد کرتیں بس سرکار کل صبح کو تو بلاسو ہاتھوں پر آگئیں۔ سرکار رانی صاحبہ نے کل دوپہر خاصہ نوش نہیں فرمایا تمام دن قصبہ کا ڈاکٹر مویشی لگا رہا پھر جب کوئی افاقہ نہیں ہوا تو شام کے وقت کار شہر بھیجی۔ تو پھر اس ڈاکٹر کے علاج سے کچھ ٹھیک ہے

"اچھا۔ خوب! تم سے کون کہتا تھا؟ ۔ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا۔"

"حضور چھوٹی مغلانی اور ایک مہری نے مجھ سے کل شام جب ڈاکٹر آیا ہے تو تذکرہ کیا تھا کہ بڑی رانی صاحبہ بہت ملول ہیں۔ خاصہ وغیرہ تک نوش نہیں فرمایا ہے"

واہ خوب اور ہمیں کسی نے اطلاع بھی نہیں دی۔ تین دن سے شطرنج میں ۔ ہاں تو پھر بھلا آج بڑی رانی صاحبہ بیچاری کیونکر نکل سکتی ہیں اچھا مرزا جی ذرا ایک گشت تو کیجئے بندہ نواز ۔ مجھے ذرا اندر بھی جانا ہے۔ کل دوپہر بڑی رانی صاحبہ نے خاصہ نوش نہیں کیا۔ اور ہمیں شطرنج میں خبر بھی نہیں ہوئی۔ لاحول ولاقوۃ! ۔۔"

ملازم نے کہا" اور سرکار مینجر صاحب کے پاس سرکار بڑی رانی صاحبہ نے ابھی یہ اطلاع بھیجی ہے کہ ہم کل بھی نہ نکل سکیں گے۔ کل چھوٹی راجکنواری کی گڑیا کی سدھوری جا رہی ہے۔"

"ارے بھئی تو یہ حشر کب تک صورت پر سوار رہے گا۔ توبہ۔ خیران کے مرد بھی بھوت ہوتے ہیں۔ مگر کچھ کہو تو سن تو لیتے ہیں۔ یہ تو پوری پوری چڑیلیں ہیں۔ ان کا پکڑا نہ چھوٹے گا" راجہ صاحب نے شغل میں مرے ہوئے فرزین کو رخ پر ٹکرا کر کہا۔ مرزا جی یہاں سے بساط سمیٹیے اور کسی گوشہ محل میں ٹھکانا کیجیے۔ یہاں اس شور محشر میں شطرنج کھیلنا معلوم ۔"

"لاحول ولاقوۃ" راجہ صاحب کے مصاحب مرزا جی نے شور کی جانب منہ پھیر کر کہا۔ معاذاللہ! ۔۔۔ خدا پناہ میں رکھے ان بہائم سے"

"جی جناب یہ کسی کے بوتے کا روگ نہیں ہے جب تک بڑی رانی صاحبہ کو نکال نہ لیں گی چپنے والی نہیں ہیں۔ مجال کیا جو زبان تالو لگ جائے۔ یوں ہی چیخیں گی ایک آواز سب کی سب۔ اور رانی صاحبہ آج اور کل دو روز کسی بھاؤ قدم دیتی نہیں باہر ۔" راجہ صاحب نے کہا۔

عورتیں بڑے زور سے گا رہی تھیں اور محلسرا کے اندر ان قطعوں کے غول کی آوازوں نے تمام نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ اور اسی طرح دو روز متواتر محلسرا میں اندر سے لے کر باہر تک ہر چھوٹا بڑا مشغلہ انقلاب سے دوچار رہا۔ راجہ صاحب اور تینوں راجکنوار بیچارے عاجز آگئے۔ ہر چند چپانے کی کوشش کی۔ کارندوں اور مصاحبوں اور پیادوں نے بہتیرا سر پٹکا۔ مگر انہیں نہ چپنا تھا نہ چپیں۔ تو بلاسو کی طبیعت ٹھیک ہونے پر اور چھوٹی راجکنواری کی گڑیا کی تقریب بخیر و خوبی انجام پا جانے پر گویا ارض امارت کی کیلی حرکت میں آئی۔ اور بڑی رانی صاحبہ اپنے محور سے ہلیں۔

خالص بیچی کوٹے گورنمنٹ تمام زمین پر چھاگئی روایات کے مطابق چھوٹی بڑی ہر حیثیت کا مرد آج باہر نکلنے اور جنگل جانے سے ممنوع تھا۔ کچھ زیادہ نہیں محلسرا سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر راج ہل کی رسم کا انتظام تھا۔ کارندوں نے ڈیرے خیموں فرش فروش کا پہلے ہی روز سے انتظام کر دیا تھا۔۔

ہوں ناز سے معمور نزاکت سے بھری ہوں
دھانی مری پوشاک ہی میں سبز پری ہوں

رانی صاحبہ امانت کے اس شعر کی عملی تشکیل بنی محلسرا سے برآمد ہوئیں، سبز غرارہ، سبز دوپٹہ، سبز قمیص میں ملبوس دوپٹہ اور غرارہ سنبھالے ہوئے سبز پوش مہریوں اور خواصوں کے جھرمٹ میں پورے سبز پریوں کے ایک غول کی قیادت کرتی ہوئیں چڑیلوں کے اس غول بیابانی کی طرف خرام ناز کے ساتھ دو خواصوں کا سہارا لئے بڑھیں ۔ نمودار ہوتے ہی کاشتکار عورتیں سجدے میں گر گئیں۔ مخصوص گیت چھیڑا اور دونوں پریوں اور چڑیلوں کے غول آگے پیچھے روانہ ہو گئے۔ خواصیں اور مہریاں آپس میں چہلیں کرتی گلاب پاش، چتور عطردان، خاص دان، پاندان برف کی بوتلیں پانی کی صراحیاں، شربتوں کے کنٹر پھولوں کے گجرے ہاتھوں میں لئے رانی صاحبہ کے چہرے پر پھولوں کے پنکھے جھلتیں گلاب اور کیوڑے کے

خوآرے چھوڑتیں ہر ایک اپنی اپنی ادا و انداز کے ساتھ جلو میں چل رہی تھیں۔ کچھ چھوکرے اور خواجہ سرا قالینیں مسندیں اور گاؤ تکیئے سنبھالے پہلے برآمد ہو کر چند قدم آگے آگے چل رہے تھے۔ جگہ کا تعین پہلے سے ہو چکا تھا۔ اور تین روز سے تمام ساز و سامان وہاں منتظر تھا۔ پریوں کی قطار اور چڑیلوں کے غول کے درمیان ایک ٹولی خواجہ سراؤں کی حد فاصل چلی جا رہی تھی۔ محلسرا کے کچھ چھوٹے ملازم لونڈے لونڈیاں سب غول کے آگے آگے دوڑ کی بازی لگا کر کیمپ سے غول تک کا اور غول سے کیمپ تک کا ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ بار بار طے کر کے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑیں لگا رہے تھے۔ اور کبھی یہاں اور کبھی وہاں پھدکتے نظر آتے تھے۔ گانا، بجانا، ڈھول، شور، ہو ہق، تمام لاؤ لشکر کی چیخ پکار دوڑ دھوپ اور سرگرمی نے قحط کے مرگ انبوہ کو درحقیقت پورا پورا جشن بنا دیا تھا۔ ہر پندرہ بیس قدم پر جگہ جگہ مسندیں اور تکئیے لگ جاتے۔ رانی صاحبہ چلتے چلتے ہانپ جاتیں۔ اور مسند پر جا پڑتیں۔ بڑے بڑے تاڑ کے پنکھے خواجہ سرا اور مہریاں ہلانے لگیں خواصیں اور پیشدستیں پسینہ پونچھتیں، عطر سونگھاتیں، گلوریاں منہ میں رکھتیں اور کوئی مطربہ ہلکا سا ساز چھیڑتی ایک دو آواز بلند کرتی اور رانی صاحبہ دم لے کر دو خواصوں کا سہارا لے کر کھڑی ہو جاتیں۔ اسی طرح ہر پندرہ بیس قدم پر ایک قرن طے کرتی ہوئی رانی صاحبہ نے منزل مقصود کا دو فرلانگ کا فاصلہ دو گھنٹہ میں طے کیا۔ میدان اور باغ آ گیا۔

کاشتکار عورتوں کے پورے غول نے پہلے دور سے راج پوجا کی۔ پھر چند ممتاز قسم کی نمبردار کاشتکار عورتیں کورے ٹاپٹی کے لہنگے پہنے ادھوڑ کے نیل اور کسوس میں رنگے دوپٹے اوڑھے ہل بیل سنبھالے مجمع سے نکلیں رانی صاحبہ کے چرن چھوئے اور ہل کا مٹھیا پیش کیا۔ رانی صاحبہ نے ہل کا سنہرا مٹھیا پکڑا اور گز دو گز زمین گنگا جمنی پھالے سے چیری۔ جیوں ہی رانی صاحبہ کی ٹٹکاری پر بیلوں نے حرکت کی تمام کاشتکار عورتوں کے مجمع میں ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ سب کے چہرے اظہار عقیدت میں سرخ ہو گئے ہر ٹولی ایک ہی جگہ جمع ہو گئی اور گانوں گانوں کا ڈھول سب ایک ہی حلقہ میں سمٹ آیا۔ لہجے نہایت درشت ہو گئے۔ اور فلک شگاف گیتوں میں اندر دیوتا سے مطالبہ ہونے لگا۔ کہ اب تو انتہا ہو گئی۔ رانی نے ہل جوت لیا۔ اب مینہ برسنے میں کیا دیر ہے۔ اب تو گویا اندر دیوتا پر دنیا والوں کا بڑا بھاری احسان ہے۔ مینہ بھی کوئی چیز ہے اب "۔

تمام جنگل میں منگل ہو گیا۔ شامیانے، قناتیں، اور میدان سب گونج اٹھے۔ نوجوانیں جھولوں پر جا چڑھیں، ملہاروں اور ساونوں سے سارا جنگل اور میدان سروں پہ اٹھا لیا۔ رانی صاحبہ کی محفل رقص و سرود علیحدہ گرم ہوئی دوسری محلسرا والیوں کے جھولے اور ٹولیاں ایک طرف آراستہ ہوئیں، کاشتکار عورتوں کے گیت اور ڈھول دور ایک جانب میدان اور باغ میں گرم ہوئے راج ہل بڑی رانی صاحبہ کی پوری پوری پکنک ہو گیا اپنے اپنے مذاق کے مطابق جگہ جگہ چولھے گرم ہو گئے چھوٹی بڑی چاشنیاں چڑھ گئیں۔ اور اس جنگل میں جہاں کروڑوں اربوں پیاسی روحیں ایک ایک بوند کو ترس ترس کر ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کر ایڑیاں رگڑتی تھیں ترانے، نغمے اور قہقہے گونج گئے اور ہوا کے دوش پر رنگا رنگ الوان کی خوشبوئیں تیرنے لگیں۔ نغمہ، مستی اور خوشبو سے سارا میدان بھڑک اٹھا محلسرا والوں کو پوری پوری پکنک تھی اور دیہاتیوں کو پورا پورا اطمینان تھا کہ اب ربیع کی فصل کامیاب ہونی یقینی ہے غرض ؎

بلا سے گرانی ہو یا قحط سالی ——— کنھیا نے برسات خاصی منالی۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات واقعات اور حادثات اپنی ستم ظریفی دکھائے بغیر نہیں رہا کرتے۔ دوپہر سے یکدم حبس ہوا اور دھوپ میں غیر معمولی تیزی پیدا ہوئی اور سہ پہر تک مطلع ابر آلود ہو گیا۔ دیہاتنوں کے گیت اور بھی زیادہ جوش و خروش اور طنز و تشنہ اختیار کر گئے۔ اور مجمع برخاست ہوتے ہوتے تو یہ عالم ہو گیا کہ بڑی زبردست آندھی اٹھی جو بھاری بارش کی ہراول تھی۔ ڈیرہ خیمہ فرش فروش سب جیسے کے تیسے رہ گئے بڑی مشکل سے بڑی رانی صاحبہ اور مخصوص خواتین کو موٹر پہ بیٹھ کر محلسرا کا پھاٹک ملا ـــ تمام جنگل جل ہو گیا۔ راج ہل کی روایات اپنا پورا زور شور بیسویں صدی کے وسط میں بھی بغیر دکھائے نہ رہیں۔ شام تک گویا ماحول ہی بدل گیا۔ جھینگر اور مینڈکوں کے شور کے درمیان دیہاتنیں خوشی خوشی بڑے جوش و خروش کے ساتھ چنگھاڑتی چیختی زمین سے لے کر آسمان تک راجہ کے راج اور اقبال کے گیت گاتیں۔ اور حاکم اور ایشور ایک ہی چیز ہیں "، کا عقیدہ راسخ کرتی چلی جا رہی تھیں۔ ہفتہ بھر گھر گھر ڈھول رکھا رہا اور ملہاریں اور ساون ہوتے رہے اور سنجولی

اور سلونوں کو خاموشی کے ساتھ منانے کا بڑا زبردست ردِ عمل ہوا۔ کاشتکاروں نے خوب حسرتیں نکالیں گایا بجایا، ناچا تال دی۔

تقریظ

(۳)

ماشینی دور کی دنیا میں علاوہ مادی انقلابوں کے ذہنی انقلاب کچھ مشین کی تیزی سے آتے ہیں اور تقدیروں کے ستارے بھی مشین کے پہیئوں کی طرح گردشیں کرتے ہیں۔ راج ہل کے زور سے طیار کی ہوئی فصل سنہری ہی کھڑی تھی۔ زمین غلہ اور چارے کے مارے بوجھوں مر رہی تھی۔ ایک مرتبہ نکلنے کے بعد دوبارہ آفتاب برج حمل میں داخل نہ ہونے پایا تھا کہ متمدن اور جدید دنیا کی جدید تر اور پھر جدید ترین قدریں جاگ پڑی تھیں۔ "جادوئے محمود کی تاثیر کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا۔ جیسے ایک صبح نکلی تو کوئی "کاشتکاری" کے کان میں "جاگیرداری" کے راز کی اصلیت کہہ گیا تھا اور اس سخت گیر نظام کی ہر سرک پھند کی بندش زبان زد خاص و عام تھی۔ زندگی کے اکھاڑے میں ایک "دھوف" پر اپنا نظم و نسق کھود دینے والے ڈھیلے اعصاب کا آج ریشہ ریشہ ہل گیا تھا۔ ابتدائے آفرینش کی بندگی کا ردِ عمل پورے زور کے ساتھ ہو رہا تھا۔ پہلے چاروں طرف افق پہ ایک ہلکی سی سیاہ لکیر پیدا ہوئی اور دیکھتے دیکھتے آناً فاناً میں بڑی بھاری آندھی چاروں طرف سے امنڈ رہی تھی، ہو ہو ہو، ہا، ہو ہا ہو۔ عاعوں۔ عاں ۔ عوں۔ عوں ۔ دُوں دُوں ۔ اڑاڑا دوں، اڑاڑ دوں۔ چیں چیں چیں ۔" جاگیرداری برباد، زمینداری برباد۔" جیسے شیر سے لے کر ہنتنی ہنتنی گوریاں تک ایک مخلوط غول میں سینہ تانے، چیختے، چلاتے، چنگھاڑتے، دہاڑتے، چن چناتے زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز کو سر پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ برف کے تودے چنگاریاں چھوڑ رہے تھے۔ راجہ ابن الزماں صاحب بہادر کی شاندار محلسرا کا پھاٹک بدستور شان جبروت کے ساتھ کھڑا تھا۔ آندھی بڑھی ۔ بڑھی، اور دیکھتے دیکھتے غلامی کے طوفان نے خواجگی کی دیواروں سے سر جا ٹکرایا ۔ پھاٹک پر کھڑے ہوئے سنتری نے اٹھتے ہوئے گل مچھوں سے ڈھکے ہوئے ہونٹوں سے ایک "دھوف" بلند کی جو خود اس کے اپنے کانوں تک ہی نہ پہنچ سکی پھر مسکٹ کندھے پر جوڑ کر اپنا آخری فرض ادا کرتے ہوئے جلتے توے کی سطح پر ایک بوند سی ٹپکا تا ایک مشتِ غبار کیطرح ہوا میں زائل ہو گیا۔ اور تاریخ انسانی کی قدامت کا پرانا پھاٹک پتے کی طرح الٹ کر جا پڑا ۔ بس جیسے نہر کا بڑا پھاٹک کھول دیا گیا۔ محلسرا کے پھاٹک میں انسانی دریا ٹھاٹھیں مارتا، کف لاتا، چنگھاڑتا، دہاڑتا، سرّاتا چلا جا رہا تھا۔ بندگی کی پُر غضب لہریں خواجگی کے آثاروں اور ملکیت کی فصیلوں سے پورے جوش و خروش کیساتھ ٹکرا رہی تھیں۔ جمہور کی کڑک ارضِ امارت میں زلزلہ برپا کر رہی تھی۔ طوفان کی قہار موجیں بلند سے بلند تر ہوئیں تخت شاہی کے پایہ سے جا ٹکرائیں اور پھر محلسرا کے سب سے اونچے مینار کے اوپر چڑھ گئیں۔ سون کتوں کا غول ہاتھی کے جسم کو لپٹ گیا۔ انسانی گوشت پوست نے سنگ خارا کی چٹانوں سے ٹکرا کر انہیں سرمہ سرمہ کر دیا۔ آدمیوں کی گردنوں نے خنجروں کی دھاروں سے چمٹ کر انہیں موڑ کر رکھ دیا۔

پہاڑ سی دیواریں اور فصیلیں کانپ رہی تھیں، "آتش فشاں بندوقیں اور توپیں دم بخود تھیں، "آبدار تلواریں میانوں میں منہ چھپائے ہوئے تھیں"، "اسپ گُشتہ اور سگِ بستہ" مکڑیوں کی طرح اچھل کر اور مکھیوں کی طرح بھنبھنا کر رہ گئے۔ وقار شہریاری اور اقبال سلطانی کی سب روائتیں دفتر پارینہ کیطرح پرخچے اڑ گئیں۔ اور دہقان کا ٹڈی دل بغیر جڑ والی سدا بہار ہری بھری کشتِ سلطان پر جا پڑا۔

ایک رنگین خاک کا نعارہ محلسرا سے اٹھا اور یکدم تمام نالیوں سے لال لال دھاریں ابل پڑیں۔ راجہ ابن الزماں خاں صاحب بہادر، بڑی چھوٹی رانی، مہاراج کنوار بہادر، راجکنوار، راجکنواریاں دربان خدام، مصاحب، پیش دستیں، مہریاں خواجہ سرا، بڑی ہاتھی، عرب گھوڑے، بھوٹنے کتے، انگریزی موٹر، سونا چاندی لوہا، ہیرا نیلم موتی جیسے آج ہر جاندار و بے جان وجود اپنے جوہروں سے بیزار ہو کر خود ہی اپنی ہستی مٹانے پر تل گیا۔ اور آن کی آن میں جیسے ایٹم کی طاقت سے ہر چیز نے اپنے تانے بانے کی تنظیم فنا کر دی۔ اور سب کچھ ایک بھک سے اڑ جانیوالے مادے میں تبدیل ہو گیا۔

بڑا زبردست دھواں اٹھا۔ تاریخ عالم میں روئے زمین پر آج پہلی مرتبہ راجہ ابن الزماں خاں صاحب بہادر کے" پھونکنے کے قابل ایندھن پیدا ہوا" لاوے کے طوفان کی لہریں ابتدائے آفرینش سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک ایک ہی قلم کے ترتیب دیئے ہوئے فلسفہ قانون کے کتب خانوں پر جا پڑیں۔ اور اس رائے پتھورا کی کیلی کو جس پر ابد سے خدائی کی گردشیں متحرک تھی ایک تنکے کی طرح بہا کر لے گئیں۔ اور راجہ ابن الزماں خاں صاحب بہادر کی شاندار عمارت ارارارا دھڑام سے نیچے آ رہی۔

اخلاق حسین عارف

آشیانہ

عنایت جب آڑھت سے لوٹ کر آیا تو شام ہو چکی تھی۔ آفتاب مغرب میں تیر چکا ہوگا۔ اور افق پر شفق پھول چکی ہوگی۔ مگر فضا میں اٹے ہوئے کہر اور نیلے آسمان پر مٹیالے بادلوں کی وجہ سے دھند نے اسے مستور کر رکھا تھا۔ ہوا ساکت تھی۔ مگر پھر بھی ایک خاص قسم کی تیز و تند رو مسام میں پھسل کر اعضا میں کپکپی پیدا کر دیتی تھی۔ اور سرج کا چست کرتا، روئی دار بنڈی، کشمیرے کا کوٹ اور سب سے اوپر السٹر سے اپنے بدن کو محفوظ رکھنے کے باوجود وہ کپکپی سی محسوس کر رہا تھا۔ موسم سرما میں تین دن کی مسلسل پھوار کے باعث سردی دو چند بلکہ سہ چند ہو گئی تھی۔ گاڑی سے اترنے کے لئے جیسے ہی اس نے پائیدان پر داہنا قدم رکھا۔ وہی خاص قسم کی تیز و تند رو اس کے چہرہ پر پھسلتی ہوئی اعضا میں کپکپی پیدا کر گئی۔ اس نے ایک ایسی کیفیت محسوس کی جیسے کسی سرد رو نے برق رفتاری کے ساتھ اس کے تمام جسم کی چول چول کو اس طرح ہلا ڈالا جس طرح ہوا کا تیز و تند جھکڑ یا آندھی، سینکڑوں سال پرانے برگد یا پیپل کے درخت کو جھکولے دینے لگتی ہے — اس نے جلدی سے السٹر کی جیبوں سے گرم گرم ہاتھ نکال کر بڑے کالر میں کانوں کو دفن کر کے اپنے ہاتھوں کو بدستور جیبوں میں ٹھونس لیا اور بسم اللہ کر کے زمین پر قدم رکھا۔ کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے جو دس بیس قدم اسے پیدل چلنا تھے، اس وقفہ میں وہ اپنے بدن کو اس تیز و تند سرد رو سے محفوظ رکھنے کے لئے سمٹا رہا۔ کیونکہ اس نے اپنے فیملی ڈاکٹر سے سن رکھا تھا کہ سردی لگنے سے فالج یا لقوہ ہو جاتا ہے — سردی پھیپھڑوں پر بہت جلد اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اسی سے نمونیہ لاحق ہوتا ہے، یا پھر انسان رفتہ رفتہ دمہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس سے وہ گھرچ گھرچ کر مرتا ہے مگر یہ سب بدن میں کیلسیم کی کمی اور وٹامن اے اور ڈی کے نہ استعمال کرنے سے ہوتا ہے۔ — اور جب اس نے اپنا بدن سمیٹ کر آہستہ سے بھینچا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کا تنفس گھٹ رہا ہے۔ اور وہ گھبرا کر جلد جلد قدم اٹھاتا کوٹھی میں داخل ہو کر اپنے کمرے میں گھس گیا اور موٹے گدوں والی مسہری پر لیٹتے ہوئے لحاف پینڈے پر گھسیٹ کر آہستہ سے داہنا ہاتھ پسلیوں تک سرکا کر قلب کی حرکت محسوس کی جو گھٹی گھٹی تیز تیز چل رہی تھی۔ وہ چند لمحے یوں ہی ساکت و صامت مسہری پر، پیر زمین پر لٹکائے، نیم دراز رہا۔ پھر زور سے چلایا۔

"ابے او چمرو کے بچے!"

تھوڑی دیر میں چمرو کا بچہ اس کے پاس مؤدب کھڑا تھا۔ وہ پھر اس سے بولا۔

"ابے خبیث، تجھے معلوم نہیں کہ میں آگیا ہوں — نشاستہ کہاں ہے؟"

"ابھی لایا حاجی صاحب۔"

"حاجی کے بچے — ڈھونس — چل دور ہو۔"

وہ جلد ہی دور ہو گیا۔ مگر فوراً ہی ایک بڑے بلور کے پیالہ میں بادام چہار مغز، گھی، شکر اور دودھ وغیرہ کی آمیزش سے بنا ہوا نشاستہ قرینے سے چھوٹی میز، مسہری کے پاس سرکا کر رکھتے ہوئے پھر مؤدب کھڑا رہا۔ عنایت نے آتے ہوئے جب اس کے قدموں کی چاپ سنی تھی تو آنکھوں کو نیم وا کر کے اس کی مستعدی اور خدمت گذاری کا جائزہ لیکر بدستور آنکھیں بند کر کے قلب کی حرکت محسوس کرتا رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ مستقل پسلیوں کے نیچے دھڑکتے ہوئے ضعیف دل کی گھٹن اور سراسیمگی محسوس کرتا رہا۔

نشاستہ چبا چبا کر پیتے ہوئے اس نے چمرو کے بچہ سے دریافت کیا۔ "منشی اشتیاک آئے تھے —؟"

"جی ہاں، منشی اشتیاق گھڑی بھر گذرے آئے تھے۔"

"پھر —؟"

"ایک پاکٹ دے گئے ہیں۔"

"لے آ پیکٹ"

وہ باہر جا کر پیکٹ لے آیا اور اسے میز پر رکھ کر پھر اسی طرح قرینے سے کھڑا ہو کر شاید کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر موقع کا متلاشی تھا کہ اسے حکم ملا :-

"دفعان ہو ——"

اور جب وہ دفعان ہو گیا تو اس نے داہنے ہاتھ سے پیالہ پکڑتے ہوئے بائیں ہاتھ سے پیکٹ کھولنا شروع کیا۔ ہیپاٹو گلوبین ٹانک کی تین شیشیاں، ایک بڑا کھانے کا چمچہ بھر کر غذا سے پہلے دن میں تین بار پینے کے لئے، —— اُپائی کیلسیم ٹکیوں کی ایک بڑی بوتل، غذا کے نصف گھنٹہ بعد چوسنے کے لئے، —— گلوکوز ڈی کے ایک درجن ڈبے، شربت نشاستہ اور دودھ وغیرہ کے ہمراہ استعمال کرنے کو، —— شوگر کیوب کے دو درجن پیکٹ مٹھاس بنانے اور دوسری معمولی معمولی چیزوں میں ڈال کر استعمال کے لئے۔

نشاستہ کا خالی پیالہ فرش پر سرکاتے اور وٹامن اے اینڈ ڈی اور دیگر مقویات کا یہ انبار سامنے ساری میز پر بکھرا ہوا دیکھ کر اس نے تسلی آمیز انداز میں سوچا —"اب نہ اس پر نمونیہ، فالج یا لقوہ کا حملہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اسے دمہ کا روگ لگ سکے گا۔ اور اس نے اطمینان کا سانس لے کر اسٹر کی بڑی جیب سے سنکے ہوئے نمکین بادام مٹھی میں بھر لئے اور آنکھیں بند کر کے لیٹے لیٹے ٹنگار کرنے لگا —— اور سوچنے لگا —— اور اسی طرح بے خیالی میں پڑے پڑے سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کے دماغ کے آسودہ گوشوں سے کسی باریک کیڑے کی طرح آہستہ آہستہ رینگ کر کوئی چیز نکلنے لگی اور تھوڑی دیر میں اس نے تصورات کی مدد سے ایک ہیولا مرتب کیا —— ایک دھندلا نسوانی ہیولا، جس کے نقش و نگار بڑی دیر تک دھندلے رہے اس وجہ سے وہ اسے کوئی نام نہ دے سکا۔ مگر رفتہ رفتہ اس پیکر کے کھلتے گندمی رنگ سڈول اعضا، بھری بھری باہیں، ابھرا ابھرا، پہاڑ کی چوٹی کی طرح ابھرا ہوا سینہ، صراحی دار گردن، ننھی سی ٹھوڑی، رس بھرے ہونٹ، موزوں ناک، موٹی موٹی تڑپتی آنکھیں، گداز جسم سے شہناز کے پہچاننے میں اسے دقت نہ ہوئی۔

اس وقت سے، جب سے کہ یوسف شاہ نے شہناز کے متعلق اپنے عمل کے ذریعہ اس سے انوکھے انکشافات کئے تھے، عنایت کو اب اس سے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا اور جب ہی سے وہ زیادہ تر اس کے دل و دماغ پر، سوائے چند گھڑی کاروباری مصروفیتوں کے، ہمہ وقت پھر مسلط رہنے لگی تھی۔ مگر اس مرتبہ بہ نوع دگر، کبھی وہ سولہ سنگار کئے ہوئے اپنے لمبے چمکیلے سیاہ گیسوؤں کے وسط میں ایک لمبی مانگ نکال کر گوندھے ہوئے، کسی دیدہ زیب رنگ میں رنگا ہوا دوپٹہ شانوں پر ڈالے، چست قمیص اور کھڑے پائنچوں کے پائجامہ میں نمودار ہوتی، کبھی جارجٹ یا پھولدار کریپ کی سیاہ ساڑھی میں لپٹی ہوئی بال کھولے ہوئے، کبھی چُست مہری کے پائجامہ، چست جمپر اور دوپٹہ میں دھڑ سے سامنے آجاتی۔ اس نے شہناز کے ساتھ اپنی عمر کی دس بہاریں گذاری تھیں اور اس کے سڈول اعضا پر نہ معلوم سینکڑوں بار اپنی انگلیاں دوڑائی تھیں، بھری بھری باہیں پکڑ کر اپنے سینہ سے بھینچ چکا تھا، ابھرے ہوئے گرم و متموج سینے پر اپنے سرد رخسار رکھ کر اس کا زیر و بم محسوس کر چکا تھا، صراحی دار گردن پہ جلتے ہوئے ہونٹ ثبت کر چکا تھا، اور ——

وہ ایام مفلسی میں اس کے گھر میں آئی تھی اور یہ اسی کے قدموں کا فیض تھا کہ وہ گھر جو ایک محدود رقبہ میں خام تعمیر پر کھڑا ہوا سردی، گرمی اور برشگال میں نم آلود، سوکھا اور لرزا کرتا تھا۔ چند ہی سال میں اپنے چاروں طرف کی کافی زمین اپنے میں ضم کر کے ایک خوش نما کوٹھی میں تبدیل ہو گیا تھا —— آشیانہ! —— یہ نام شہناز کا رکھا ہوا تھا —— شہناز کے نکھار کے ساتھ ساتھ، عنایت میں صحت، جوانی اور امنگ اور خام عمارت خوبصورت طرز نو کے آشیانہ میں ڈھل چکی تھی۔

وہ اس کی بڑی چہیتی تھی۔ اور وہ بھی اسے بہت پیار کرتی تھی۔ وہ اس کی ہر مسرت پر مسرور اور ہر اندوہ پہ اندوہ گیں رہتی۔ عنایت سے وہ کبھی نہ جھگڑی تھی۔ ہاں کبھی کبھی وہ اگر کسی بات سے اس پر برافروختہ ہو گیا، تو فرمانبردار اور چہیتی کی طرح خندہ پیشانی سے اس نے اس کی خفگی کو انگیز کیا۔ شہناز سے عنایت کے دو بچے ہوئے اور دونوں کچھ عرصہ زندہ رہ کر عدم کو سدھار گئے۔ تیسرا بچہ دسویں سال بڑی منتوں، بڑی مرادوں

سے ہؤا جو شہناز کیلئے پروانۂ اجل لے کر آیا۔ کیونکہ وہ زچگی میں تپ ولرزہ میں مبتلا ہو کر جانبر نہ ہو سکی اور عنایت کو بلبلاتا اور دھاڑیں مار کر آشیانہ کے در و دیوار سے ٹکریں مارتا چھوڑ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئی ــــ لڑکا دس ماہ تک زندہ رہا۔ اس کے لئے عنایت نے ایک انّا کا انتظام کیا۔ پھر اس سے مطمئن نہ ہو کر اس نے بچہ کی خالہ کے کہنے سننے پر اُسے اس کے حوالہ کیا۔ مگر خالہ کی نگہداشت میں وہ اس پودے کی طرح روز بروز کمہلاتا گیا۔ جس کی جڑوں میں دیمک لگ گئی ہو۔ آخر ش وہ بھی اپنی ماں کی گود کی طرف ہُمک کر چھلانگ لگا گیا۔

عنایت اس صدمہ کی تاب نہ لا سکا۔ اسی زمانہ میں ایام حج قریب تھے، اس پر نمعلوم کیا گذر رہی تھی۔ کہ باوجود غم و الم کا پہاڑ ٹوٹ پڑنے کے اس نے اتنے لمبے سفر کا عزم کیا۔ اور ایک دن رختِ سفر مکمل ہو جانے پر بسم اللہ کر کے حج کو چل پڑا۔ اس صدمہ جاں کاہ کے باعث اس کے مزاج میں حیرت انگیز تضاد پیدا ہو چلا تھا، نیک مزاجی کی جگہ تنک مزاجی اور سنجیدگی کی جگہ چڑچڑے پن نے لے لی تھی نوکروں اور دوسرے ماتحتوں کو ذرا ذرا سی بات پر جھڑک دیتا۔

دورانِ حج کی مصروفیتوں، اسلامیانِ عالم کے مسلمانوں سے میل محبت، گفت و شنید، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے تاریخی مشاہدات میں شہناز کو بہت کچھ بھول چکا تھا۔ مگر وطن میں واپسی پر جیسے جیسے وہ گھر سے قریب ہوتا جاتا، ویسے ویسے اس کے لاشعور سے شعور میں منتقل ہوتی ہوئی شہناز کروٹیں لینے لگی اور دس سال کے ایک سو بیس مہینے، مہینوں کے ہفتے، ہفتوں کے دن و رات اور دنوں اور راتوں میں وقوعہ واردات اس کے تخیل و تصور پر چھانے لگے۔ یہاں آ کر وہ پھر اداس و غمگین رہنے لگا۔ اسی دوران میں کنبے کے لوگوں نے پکڑ دھکڑ کر کسی دن خاندان کی ایک لڑکی رضیہ سے اس کا عقد ثانی کرا دیا۔

پھر ــــ اپنی دوسری منکوحہ سے منسلک بظاہر وہ ملتفت ہو کر رفتہ رفتہ خوش رہنے لگا۔ اب اس کا رنج و غم اس کے حسن و سلوک، اس کی بھولی بھالی صورت اور اس کے محاسن میں مدغم ہو کر شہناز کے ساتھ دس سال کا لگاؤ اور اس کی مفارقت ایک بھولا سا افسانہ بن گئی۔ اب وہ اسے کبھی کبھار یوں ہی یاد آ جاتی وہ بھی جب کوئی خاص واقعہ درپیش

ہوتا یا اس کی کوئی استعمال کی ہوئی چیز اس کی نظروں کے سامنے ایکا ایکی آ جاتی۔ مگر اس کے تاثرات پہلے کی طرح شدید نہ ہوتے۔ بلکہ اس کی مثال بالکل ایسی ہوتی جیسے پردۂ سیمیں پر بائیں سے دائیں جانب یا نیچے سے اوپر پھسلنے والی ریل جو ایک منظر دکھا کر گذر جائے اور اس کی جگہ دوسرے نوع کا منظر آ کر اس پر چھا جائے۔

کچھ دنوں بعد عنایت کے ہاں لڑکا پیدا ہؤا مگر وہ کسی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں بعد جاتا رہا اور اس کی بیوی برے برے ہیبت ناک خواب دیکھنے لگی ــــ خوفناک اور ڈراؤنے خواب ــــ جیسے وہ کسی ایسے مقام پر یکہ و تنہا کھڑی ہے جہاں ویرانی برس رہی ہو۔ بڑے بڑے خوفناک سائیں سائیں کرنے والے تناور درخت، خونخوار کالی کالی نیلی نیلی آنکھوں اور نکیلے پنجوں والے آدم خور، گنجان جھربیری کے خودرو پودے اور خاردار جھاڑیاں، ان کے چاروں طرف تمام قبریں ہی قبریں، منہدم آدھا منہ بند کئے آدھا کھولے، کچھ دھنسی ہوئی بے ثباتیٔ جہاں پر خندہ زن اس میں سے گندی ارواح جھانک جھانک کر اس پر قہقہے لگاتی ہوئی، کچھ سلوٹر جن پر حسرت و یاس برستی ہوئی اور ان سب کے درمیان کسی کھیس نکالتی ہوئی قبر سے ایک دراز قد اور متناسب اعضا والی ایک جوان رعنا اپنے لمبے چمکیلے دراز گیسو شانوں پر بکھیرے ہوئے اس کی طرف لپکتی جیسے وہ اسے اپنی مضبوط گرفت میں دبوچ کر قفسِ عنصری سے اس کی روح کو نچوڑ لے گی ــــ اور رضیہ قوتِ برداشت کی انتہا کو پہنچ کر رات کے سناٹے میں "آشیانہ" کو ایک خوفناک و جگر خراش چیخ سے دہلا دیتی، اور قریب و دور لیٹے ہوئے تمام گھر کے افراد سراسیمہ، ننگے پاؤں اس کے کمرہ کی جانب بے تحاشا مدد کو دوڑ پڑتے۔

پہلی بار تو عنایت اس رات کا بقیہ حصہ آرام کرسی پر رضیہ ہی کے کمرہ میں کمبل پیروں پر ڈال کر اونگھتا رہا۔ مگر اس قسم کی واردات نصف شب کے سکوت میں جب آشیانہ میں دو ایک بار وقوع پذیر ہوئی تو اس نے اپنی رشتہ کی ایک خالہ کو رضیہ کے کمرہ میں سلانے کا انتظام کر دیا۔

مگر جب وہ بھی خوابوں کی دنیا کی خوفناک سیر سے نہ بچ سکی اور کبھی کبھی غافل نیند میں وہ اچھل پڑتی جیسے کوئی اس کی مسہری الٹے دے رہا ہو ــــ کبھی وہ آشیانہ کی عقبی ویران گلی میں سیر کر نکل جاتی تو وہاں

کسی سائے کے تعاقب سے ڈر کر لرزاں بے تحاشا مدافعت کرتی ہوئی کوٹھی میں گھسنے لگتی، تعاقب کرنے والا سایہ کسی لمحہ تو اس سے بہت دور ہوتا مگر جیسے ہی وہ کوٹھی میں داخل ہونے لگتی وہ بہت تیزی سے اس کی طرف لپک کر چوٹی سے پکڑ کر اس کو پیچھے گھسیٹتا اور رضیہ کی مارے خوف کے گھگھی بندھ جاتی جیسے بیتاب و ہراساں روح تنومند جسم سے پھڑپھڑا کر پرواز کرنے پر آمادہ ہو۔

خوفناک خوابوں اور ہیبت ناک واہموں کا یہ سلسلہ جب لا متناہی ہو کر جانکاہ ثابت ہونے لگا۔ تو عنایت نے حتی المقدور جھاڑ پھونک اور دعا تعویز کی طرف رجوع کیا اور ایک زمانہ تک گنڈوں، تعویزوں اور پیپل کے پتوں پر لکھے ہوئے نقوش رضیہ کو باندھنے اور چاٹنے کے لئے دیئے جانے لگے۔ کسی نے چار کیلیں مسہری کے چاروں پاؤں میں گاڑنے کو دیں تو کسی نے گھوڑے کی نعل چوکھٹ پر الٹی طرف سے گڑوا دی مگر ان سب سے جب رضیہ کی شکایات دور نہ ہوئیں۔ تو اس نے ایک گہرے دوست یوسف شاہ کو جو صوفی منش اور ریاضت والے بزرگ تھے کچا چٹھا لکھ بھیجا جو دوسرے شہر میں رہتے تھے اور ان سے اس ضمن میں مشورہ طلب کیا بلکہ انہوں نے جب عمل شروع کرنے کا وعدہ کیا تو انہیں آنے کی دعوت دی ——

"دودھ لایا ہوں حاجی صاحب" چمرو آہستہ سے بولا۔

ایک لمحہ خاموشی رہی پھر اس نے وہی جملہ دہرایا تو عنایت چونک کر خوابوں کے پردے چیرتا ہوا اہنگاسوں کی بستی میں پھر پھاند پڑا۔

"ہاں —" وہ بولا "لے آیا"۔

"جی ہاں —— آپ کے حکم سے اس میں چار انڈوں کی زردی پھینٹ دی ہے"۔

"اچھا" کہہ کر وہ تکیوں پر کہنی کے سہارے نیم دراز رہا۔ ڈاڑھ میں کچلے ہوئے نمکین باداموں کے اٹکے ہوئے میدے کو زبان پھرا کر ادھر ادھر سے وسطی حصہ میں لا کر نگلتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس لے لیا اور بالائی چبا چبا کر پینے لگا۔ چمرو موقع پا کر دونوں پنجوں کے بل اکڑوں بیٹھ کر اس کی پھیلی ہوئی پنڈلیاں رساں رساں سونتتے ہوئے اٹک کر بولا۔

"حاجی صاحب ...... گاؤں سے بڑا بھائی آیا ہے ..... کچھ

..... کچھ خرچہ ورچہ مل جائے تو بھیج دوں"

اس پر ڈانٹ پڑی "ابے کنجڑے — روز روز خرچہ۔ ابھی اپنی ماں کے گیارھواں بچہ ہونے کے موقعہ پر سو روپے بھیج چکا ہے — کیا اپنے گھر میں تو ہی اکیلا کماست ہے اور سب سالے مرگئے — !"

وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ "بس جب لاج رکھنے کا وقت آتا ہے۔ تو ہماری نظریں اپنے مالک ہی پر پڑتی ہیں"۔

"اب کون تیری لاج اتارے لیتا ہے —— زمیندار کو لگان دینی ہے کیا —؟"

"جی نہیں —— چھوٹی بہن کی سگائی ہے —"

"سگائی ہے !!"

"جی ہاں، سیانی ہوگئی —— تیرہ چودہ سال کی۔ اب کی عید کے چاند اس کے کام سے چھٹکارہ مل جائے تو جانئے بڑا کام ہوگیا"۔

تیرہ، چودہ سال کی، عنایت نے سوچا اور ساتھ ہی اس کا ذہن تخیل کی مدد سے جست لگا کر کسی اور جانب ملتفت ہوگیا —— آڑھت کے سامنے والے چھوٹے سے گول بنگلہ کے عقبی حصہ کی چھوٹی سی بیضاوی کھڑکی جو پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی اور جس میں سے وہ تقریباً روز اس گول گول بانہوں، رسیلی آنکھوں والی چھریرے بدن کی بنگالی لونڈیا کو دیکھتا تھا جو اسے کبھی چلمن کی اوٹ سے اک نگاہِ غلط انداز سے دیکھتی ہوئی نسیم سحری کی طرح گذر جاتی اور کبھی اک اندازِ دربائی سے برق گراتی ہوئی نظر آتی اور کبھی کھڑکی کے چوبی پٹ پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر کنکھیوں سے دیکھنے لگتی اور جب وہ اپنی اچٹتی ہوئی نگاہیں اس پر ڈالتا تو جھٹ وہ فضا میں اڑتی ہوئی کنکھیوں کو بہ اندازِ معصومانہ گھورنے لگتی اور عنایت پیار میں اسے ایک موٹی سی گالی دل ہی دل میں دے کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ اسے اس کی لانبی لانبی سرخ ناخنوں والی انگلیاں، نیلی نیلی شباب آور مستانہ آنکھیں، لال لال ہونٹ اور چکنے چکنے سپید سرخی مائل گال، بڑے بھلے معلوم ہوتے اور وہ چاہتا کہ کاش حضرت سلیمان والی اڑن قالین اسے ایکبار مل جائے کہ وہ اس پر بیٹھ کر اس کے پاس جائے اور اس کی کمر میں اپنا ہاتھ حائل کر کے اسے اٹھا کر قالین پر بٹھالے اور اسے لے کر کہیں دور، فضا میں اڑتی ہوئی کنکھیوں سے بھی اوپر، زمین اور آسمان

کے خطِ کشش سے بھی پرے، زہرہ یا مشتری کی دنیا میں اڑتا ہوا چلا جائے جہاں سے انہیں پھر کوئی واپس نہ لا سکے —

اور وہ اس وقت اس کے دماغ پر ایک کیف آگیں ساحرہ بن کر چھائی جا رہی تھی کہ یوسف شاہ صاحب کی آمد کی اطلاع نے اس کی دنیا کو درہم برہم کر دیا۔ اور وہ اپنے تخیلات کی ملکہ مہر نگار کو تھپکی دے کر سلاتے ہوئے کھنکھار کر چہرو سے بولا۔

"اچھا بے اچھا —— خرچ دے دیا جائے گا، کل صبح یاد دلا دینا"

یوسف شاہ حسب وعدہ جمعرات کی شام کو رجوع ہو گئے، آج وہ رضیہ کے خوفناک خوابوں اور روح فرسا واہموں کا جنازہ نکالنے والے تھے۔ دن سے سب انتظام مکمل ہو چکا تھا، رضیہ کے کمرہ کا فرش دھلوا کر چکنی مٹی سے لیپ دیا گیا تھا۔ عود و عنبر وغیرہ سے معطر کر کے اگربتیاں سلگا دی گئی تھیں ایک مٹی کے پھیلے ہوئے پیالے میں کوڑیالو بان سلگا دیا گیا اور قریبی عزیز کی ایک دوشیزہ لڑکی زینت شاہ صاحب کے عمل کا ذریعہ بنی، نہائی دھوئی، دراز سیاہ لٹیں شانوں پر بکھیرے ہوئے سرتاپا سفید کپڑوں میں ملبوس وہ پسے ہوئے فرش پر کھنچے ہوئے ایک گول دائرہ میں پالتی مار کر بٹھا دی گئی۔ شاہ صاحب نے بائیں جانب بیٹھ کر پہلے اسے چند ضروری ہدایات دیں اور خوف زدہ نہ ہونے کی خاص طور پر تاکید کرتے ہوئے انہوں نے عنایت کو دائیں جانب ذرا فاصلہ سے فرش پر بیٹھنے کو کہا اور اپنا عمل شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد عمل کا تمہیدی حصہ ختم کر کے انہوں نے زینت کو ایک انگشتری دی جس میں سرسوں کے دانہ کے برابر ایک سرخ نگ آویزاں تھا اور اسمیں بائیں آنکھ دبا کر دائیں آنکھ سے بغور نگ پر گھور کر دیکھے جانے کی تاکید کی اور عمل کا پہلا جزو ختم کر کے دریافت کیا۔

"کچھ دکھائی دیتا ہے —— ؟"

زینت بولی "ہاں —— ایک سیاہ دھبہ —— بہت فاصلہ پر ——"

یوسف نے اب عمل کا دوسرا جزو زیر لب بڑبڑانا شروع کیا۔ اسے مکمل کر کے پھر استفسار کیا "اب کیا دکھائی دیتا ہے؟"

وہ بولی "اب وہ دھبہ ذرا بڑا اور قریب ہے —— مگر واضح نہیں"

پھر تیسرا جزو شروع ہوا، اس کے اختتام پر انہوں نے سوال کیا۔ "اب کیا دکھائی دیتا ہے ——"

"اب ایک عورت دکھائی دیتی ہے، جسے دو قوی ہیکل آدمی بازو سے پکڑے ہوئے ہیں۔"

چوتھا جزو پڑھ کر عمل پورا کرتے ہوئے انہوں نے سوال کیا تو وہ بولی۔ "اب وہی لمبے تڑنگے فیل پیکر آدمی اسے کشاں کشاں پوری قوت سے گھسیٹتے ہوئے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں —— اب وہ اسے گھسیٹ کر ایسی جگہ لے آئے ہیں جہاں ایک سیاہ وسیع گول دائرہ ہے، —— اب وہ اس دائرہ کے اندر اسے لئے ہوئے کھڑے ہیں۔"

"اچھا ان میں سے ایک سے کہو کہ لکڑی لے آئے۔" یوسف بولے زینت نے وہی جملہ دہرایا تو "لکڑی کا ایک انبار لگ گیا" وہ وقفہ سے بولی۔

"اب اُسی سے کہو کہ عورت کو انبار میں رکھ کر آگ لگا دے۔" یوسف پھر بولے۔

اس نے دہرایا —— بولی

"آگ لگا دی گئی —— اب کچھ نہیں جلی ہوئی لکڑیوں کا ڈھیر، کوئلہ اور راکھ"

"بس بیٹا۔" یوسف آنکھیں کھول کر متبسم انداز میں بولے۔ "شکر الحمد للہ، چڑیل کا خاتمہ ہو گیا ...... فتنہ پرور روح کو نذرِ آتش، کر دیا گیا، —— اب حاجی عنایت اللہ کی بیگم صاحبہ کو تمام بلاؤں سے نجات پا کر چین کی نیند سونا نصیب ہو گا۔"

میدانِ عمل ساکت ہوا، زینت کو گھر پہنچا دیا گیا، یوسف شاہ عنایت سے بڑی دیر تک باہر کے کمرہ میں ادھر ادھر کی گفتگو کرتے رہے۔ پھر دونوں نے مل کر شب کا کھانا وہیں کھایا اور عنایت عشا کی نماز پڑھ کر سو رہے تو عنایت بھی اپنے کمرہ میں آکر لیٹ گیا۔

مگر تقریباً نصف شب کے عمل پر عنایت کے کمرہ سے بلبلا کر چیخنے کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ کمرہ اندر سے بند تھا اس لئے کسی کی رسائی ناممکن

(باقی بر صفحہ ۴۹)

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

نوائے درد پسِ گردِ کارواں نہ سہی
دلیلِ راہِ طلب ہی سہی فغاں نہ سہی

تُو ہی بتا کہ دلِ سوختہ ہے کس کا نشاں
تری نظر ہی سہی، برقِ بے اماں نہ سہی

جبینِ شوق تو ہے، دولتِ نیاز تو ہے
نہیں جو میرے مقدر میں آستاں نہ سہی

نصیبِ شوق ستم ہائے روزگار تو ہیں
کفیلِ عشقِ بُتاں عمرِ جاوداں نہ سہی

نگاہِ لُطف قفس پر بھی ہونے والی ہے
نہیں جو بجلیوں کی زد میں آشیاں نہ سہی

وفا کسی سے بھی ہو، میں وفا کہوں گا اسے
وُہ مہرباں تو ہوئے مجھ پہ مہرباں نہ سہی

ہوئی تو نرگسِ مخمور شبنم آلودہ
فریبِ حسن سہی، پُرسشِ نہاں نہ سہی

حفیظؔ کس لئے پھر نیند آئی جاتی ہے
قفس کے پردے میں کوئی فسانہ خواں نہ سہی

رفیق علی

بے تحاشا

شہزادی ابھی تک تو نہایت اطمینان سے کھونپیں بھر رہی تھی مگر اب اس کی پتلی پتلی سینک سلائی سی انگلیاں ذرا تیزی سے چلنے لگیں، وہ لمبی لمبی بینگی ٹیڑھی کھونپیں بھرنے لگی جیسے اس بخیہ سے وہ عاجز آ گئی ہو، اپنی زندگی کی بے کیف بخیہ گری سے بھی اس کا دل اچاٹ سا گیا تھا۔ وہی ساٹن، وہی کریپ، وہی پوت، وہی قینچی، ٹھنڈ سے اکڑی ہوئی انگلیاں کہ دل تو چاہ رہا ہو انہیں بھٹی میں رکھ دو مگر نہیں، وہی کانٹ چھانٹ، امّی کا غرارہ کھڑا کرنا، ننھے کے کرتہ میں ٹبن ٹانکنا، بھیّا کی پتلون میں اس سلیقہ سے پیوند لگانا کہ پتہ نہ چلے، پیوند اور سلیقہ! پھر دیکھنے والا پہچان نہ سکے، وہ اپنی زندگی میں بھی تو بھونڈے بھونڈے سے پیوند لگاتی رہی ہے، دوسرے اسے اس کے سلیقے پر محمول کرتے ہوں۔ مگر وہ اپنی حرکات، عادات اور پسند کا عمیق احساس رکھتی تھی، بعض اوقات وہ اپنی نازک انگلیوں کو قینچی کی گرفت سے آزاد کرکے یوں دیکھتی جیسے وہ کسی اور شے کے لئے بنی ہوں۔ جنہیں وہ اپنی سہیلی نجمہ کی کسی ایسی ویسی بات پر اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا کرتی —— پھر وہ انگلیاں گھنٹوں پھڑکتی ہوئی معلوم ہوتیں جیسے جوانی کا سارا احساس ان ہی میں سمٹ آیا ہو، جوں جوں ساٹن، کریپ اور پوت کی نرمی کے لمس کا احساس شدید ہوتا جاتا اسے اپنا ماحول پھیکا اور اپنی زندگی کھردری معلوم ہوتی۔

دھم دھم دھم!!! لڑکیاں اب بھی چھت پر ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھیں، شہزادی نے بےچینی سے کئی پہلو بدلے، مگر امّی نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا "تیرا بھی دل چاہ رہا ہے ان کے ساتھ کدکڑے لگانے کو"—— اور وہ اس کی تمام اضطراری، سیمابی کروٹیں جیسے برف میں لگا دی گئی ہوں اور وہ کچھ غصہ، کچھ جھنجھلاہٹ سے اماّمن پر برس پڑی "جب روز انگیٹھی کمرہ میں رکھی جاتی ہے تو پھر آج یہ کوتاہی کیوں" اور اماّمن کہہ رہی تھی "بیٹا آج صبح سے بادل سے تھے اسی لئے سردی کم تھی۔ ورنہ بیگم مغرب سے ہی تقاضا کرتیں" اور شہزادی کچھ روہانسی ہو کر کہتی جا رہی تھی "ہاں ہاں سردی تو بیگم ہی کو لگتی ہے ہم تو مراثی جیسے ہم انسان ہی نہیں......." وہ جملہ ختم بھی نہ کرنے پائی تھی۔ کہ امّی نے جھڑک دیا "مت زبان لڑا!.... بڑا پالا پھٹا پڑ رہا ہے ان پر!"

—— ننھی زینہ کے پاس لپسری ہوئی اپنی چیخوں کو دبانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، اس کی ایک سلیپر اس سے کوئی دس گز کے فاصلہ پر پڑی ہوئی تھی، اس نے اپنا اچھا خاصا دوپٹہ بکری کی طرح چبا ڈالا تھا، چوٹ اور سردی سے اس کی گوری گوری پنڈلیاں سرمئی سی ہو گئی تھیں، وہ شدت درد سے دوہری ہوئی جا رہی تھی اور یوں جھوم رہی تھی کہ آسیب کا دھوکا ہو جائے، اسے ارمان بھی بہت تھا جن کے شہزادے کا، وہ بڑے نخرے سے کہا کرتی "ہم تو نہا کر، بال کھول کر کوٹھے پر گھنٹوں ٹہلے، ہمارے اوپر تو نہ جن آیا نہ جن کا بچّہ!"....

وہ بھاگی بھی تو "جن کے شہزادے" کو دیکھنے کے لئے مگر چونکہ "جن" اس سے ناراض ہو گیا تھا اسی لئے اسے یہ سزا ملی ہے، اس نے کئی مرتبہ اپنے کان پکڑے جیسے کہنا چاہتی ہوں "توبہ میری اب یوں نہ بھاگوں گی"۔ مگر زینہ کی سیڑھیاں اب بھی اس کا تمسخر اڑا رہی تھیں، قہ قہ!!! "اتنی بے تحاشا کیوں دوڑتی ہو میری بنّو"۔ پھر جیسے ردّ عمل کے طور پر وہ اپنی لاابالی بے ہنگمی اور بیوقوفی پر ہنس پڑتی، مگر اس بے ہنگمی اور بے وقوفی میں بھی ایک درد تھا، ایک شدید چوٹ، ایک نرم کسک جو اس نے سعدی کی گلستاں اور بوستاں ختم کرنے پر بھی محسوس نہ کی، اس کے بھیگے بھیگے متبسم لب دائرہ سا بناتے ہوئے کرب و بےچینی کی وسعتوں کو بہت محدود بناتے گئے، درد کی تکلیف میں بھی اسے اپنی سراسیمگی کے اخفا کا بڑا خیال تھا، وہ بہت پریشان تھی، آخر یہ چوٹ لگنے پر خود بخود آنسو کیوں آ جاتے ہیں، اس کے اتنے ضبط کے

باوجود آنسو تھے کہ امڈے چلے آرہے تھے، اشکوں کے ان بلائے مہمان نے اسے کتنا لاچار اور کسقدر بیکس بناڈالا تھا، مراتی کوئی چوٹ چھپانا چاہے بھی تو نہیں چھپا سکتا، وہ یہی سوچتی! اب اگر لونڈیاں پٹیں تو تمسخر کریہی کہیں گی " رورہی ہے بوڑھی دھڈو"۔ مگر وہ کیا کرلے، چیخوں کا روکنا اس کے بس کا تھا وہ اس نے پلّو سے روک لیں، مگر یہ آنسو نہ جانے دل کی کون سی تہوں میں چھپے ہوتے ہیں کہ ذراسی ٹھیس لگی اور چھلک پڑے،۔

وہ آنگن اور چھت کے درمیان معلّق سی تھی، سہیلیوں میں شامل ہونے کی تمنا اور "شہزادی کی امّی" کا خوف، وہ یوں اب کب تک ایسی پڑی رہے گی، وہ اکیلی تھی، بالکل اکیلی، امّی کی چھالیا کاٹنے کی آواز جاڑوں کی راتوں کی سرد اور یخ بستہ خاموشی پر ہلکی ہلکی ضربیں لگا رہی تھی۔ ادھر اس کی سسکیاں سروتے کی نپی تلی تانوں سے اونچی نہ بڑھیں،

ننھی چاہتی تھی کہ شہزادی ہی کے کان میں اس کے کراہنے کی بھنک پڑجائے، مگر اس کی یہ توقع بھی موسمِ سرما کی طرح طویل تھی، اسی لئے درد اور مایوسی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ بڑبڑائی " خدا نیکی دے اس پتھر کی بنی شہزادی کو، کوئی مرہی کیوں نہ جائے مگر ٹس سے مس نہ ہوگی "۔ ادھر شہزادی نے جھنجھلاہٹ میں اپنی پوریں لہولہان کرلی تھیں۔

" جھیتم جھیتم " کی مبہم سی آواز لمحہ بہ لمحہ زیادہ واضح ہوتی جارہی تھی۔ گیس کی لالٹینوں کے مہیب اور پراسرار سائے اس کے ذہن کے تاریک گوشوں میں نغمہ بن کر ناچ رہے تھے، اس نے زندگی کی ایک نئی تازگی سی محسوس کی جیسے اس کے لاشعور کی تمام مردہ اور نیم جان خواہشیں جاگ اٹھیں ہوں، دوڑ رہی ہوں، ایک کشمکش سی ہو، تمام رکاوٹیں یوں ٹوٹ رہی ہوں جیسے انگڑائی لیتے ہوئے اس کے چورچور، نڈھال جسم کی ہڈیوں کا احتجاج۔

چھت پر اس کی سہیلیوں کے قہقہے تو اور زیادہ شوخیوں میں رچ گئے تھے، اُف ان کی بیباکیاں شہاب ثاقب کی طرح مسرت کا احاطہ کئے ہوئے تھیں، ان کی ہنسی میں بے چینی تھی، سوز تھا، رمزیت تھی،۔

وہ بھی ان پر اسرار قہقہوں میں تحلیل ہوجانا چاہتی مگر زینہ کی سیڑھیوں کے خوفناک، تاریک اور سرکش جبڑے اس کے جذباتی تموج کا مذاق اڑا رہے تھے، یہانتک کہ ڈھول تاشوں نے سڑک کی خاموش فضا میں کہرام سا مچادیا، وہ اپنی چوٹ کو بھول سی گئی، اس نے کئی مرتبہ اٹھنے کی ناکام کوشش بھی کی۔ مگر جوں جوں باجے کی آواز تیز اور کرخت ہوتی گئی۔ ننھی بیکسی، تنہائی اور ناکامی کے احساس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور اس کے شدید قسم کا کرب محسوس کیا، وہ چلّا اٹھی " ہائے اللہ میں مری "۔۔۔

آناً فاناً جیسے مردہ و نیم جاں سیڑھیوں میں جان پڑگئی ہو، ایسا معلوم ہوتا جیسے ننھی شہزادی کے ایک اشارے پر بے شمار پریاں اکٹھی ہو گئی ہوں، ان میں سے کوئی اس کی پنڈلیوں کو سہلا رہی تھی تو کوئی بطور احتجاج کہہ رہی تھی " بہن! اتنی لمبی لمبی چیخیں بھی مارتے ہیں، میرا تو دل ابھی تک دھڑک رہا ہے "۔ کوئی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی کراہوں کو بند کرنا چاہتی تو وہ اور زیادہ زور سے چیخنے کی دھمکی دیتی، اس پر کوئی دل جلی اس کے منہ میں انگلیاں ڈال کر اس کے جبڑے پھاڑتی " لے چیخ جتنا تیرے کلیجے میں دم ہو ...... بہن سب دھنارے آج ہی کرلیجو، کل کے لئے کچھ نہ رہ جائے "۔

امّی کی چارپائی جونہی چرمرہوئی اور وہ بھاگیں ہوائی توائی، اور ایک مرتبہ پھر وہ اکیلی رہ گئی،۔

وہ نیم جان سی پڑی تھی اور امی ترڑق رہی تھیں " توڑ ڈال ہڑیاں لپلیاں ان براتوں کے پیچھے، ایسی بے تحاشا بھاگتی ہیں کہ توبہ ہی بھلی، نہ جانے یہ کون سی پھٹکار ہے، میرا تو بھیجا پگھل گیا ان کو سمجھاتے سمجھاتے ارے میں کہتی ہوں ان کے اما بادا ایسے ہیں جو یوں چھوڑ رکھا ہے سانڈنیوں کو ....." اگر شہزادی آڑے نہ آتی تو وہ بہت کچھ کہہ ڈالتیں، بیچاری شہزادی تو یوں گھبرائی گھبرائی سارے گھر کو کھوند ڈال رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑا سانحہ ہوگیا ہو، جیسے ان کی " دھم دھم " سے سچ مچ گھر کی چھت گر پڑی ہو، وہ دوڑی دوڑی ہلدی چونا لائی، کرچھے میں گرم کیا، پھر گرم گرم اس کی پنڈلیوں اور کہنیوں پر تھوپا، اس کے گالوں پر زمبک ملا۔ اسے اٹھا کر لحاف کی کئی تہوں میں دبادیا اور پھر بڑے پیار بھرے لہجہ میں بھرائی ہوئی آواز میں بولی " ننھی کہاں کہاں

چوٹ لگی ہے .... صاف صاف بتادو، دیکھو پھوڑ کی جگہ روز بروز ابھی گرم گرم ہلدی رکھی ہوئی ہے ......" اور ننھی یہی سوچ رہی تھی۔ کہ اس چوٹ نے اپنی جگہ بنالی جب کبھی پردا جلے گا تو یہی چوٹیں پھر ابھر آئیں گی۔

دوسرے دن شہزادی جب کوٹھے کے کمرہ کو دیکھنے گئی تو اس نے بڑی وحشیانہ نظروں سے اس پراسرار کھڑکی کی طرف دیکھا جس کے پیچھے کل ننھی نے اپنا یہ حال کیا تھا، اس نے روزنوں میں سے جھانک کر سڑک کو دیکھا، اکا دکا تانگہ یا کچھ راہگیر کھڑکی کا نیا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ "یہ ان کمبختوں کی ہی حرکت ہے!" وہ بڑبڑائی "ابھی امی سے کہہ دوں تو ان کا کوٹھے پر آنا بھی بند ہو جائے"۔ اس نے بڑی متحیر نظروں سے اس اونچی دیوار کو دیکھا جس پر سے وہ برات دیکھنے کا دعویٰ کیا کرتی تھیں اسے ان کے دعوے کی اصلیت کے بارے میں یقین سا آگیا۔ جب اس نے دیوار سے لگی ہوئی کئی چارپائیوں کو دیکھا تو اسی برات دیکھنے کے لئے اتنی کاوشیں، ان کی ان طفلانہ حرکتوں پر اس کے دل میں ہمدردی کی نئی لہریں اٹھتی اور پھیلتی رہیں،

جب وہ چھت سے نیچے آئی تو اس کی امی ایک نیا سا تالا لئے ہوئے زینہ کے پاس کھڑی تھیں ---- اور پھر وہ لمبا چوڑا تالا تمام محلہ کی نوجوان لڑکیوں کی آنکھوں میں کھٹکتا رہا۔ کیونکہ محلہ بھر میں شہزادی کا ہی مکان دو منزلہ تھا۔ جہاں سے وہ بارات آسانی سے دیکھ سکتی تھیں، ان سب نے اس کے لاکھ نتے پیر جوڑے کہ وہ اس کا کنجیوں کا گچھا چرا کر دیدے مگر اس نے سنی ان سنی کر دی، وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ ان کے ساتھ سلوک کر رہی ہے، وہ ان کی ہڈیاں پسلیاں محفوظ رکھنا چاہتی تھی، بیچاری ننھی کا جو حشر ہوا وہ سب کو معلوم تھا، پھر یہ جوش و خروش کیا؟ یہ ہٹ دھرمی کیوں؟

شہزادی کو اپنے جسم کے بڑھنے کا شدید احساس تھا، ہر سال پرانے کپڑے کچھ نہ کچھ تنگ ہو جاتے، اور یہ احساس اس دن سے تو اور زیادہ قوی ہو گیا جب ننھی کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ جانے پر اس کی ماں نے اس کے سینہ پر چٹکی لی تھی۔ اس واقعہ نے شہزادی کے ذہن پر گہرے نقوش کندہ کر دیے۔ اس نے اپنی طبیعت ٹھیک کرنے کے لئے اپنی سہیلی سے بھی ذکر کیا، "نجمہ تم نے کہیں دیکھا کہ کوئی ماں اپنی چہیتی کی جوانی کو کوسے، سچ کہتی ہوں بہن مجھے ننھی پر بڑا ترس آتا ہے"...

اسے اپنی سہیلیوں کی طرف سے ایک قسم کی جذباتی بیگانگی محسوس ہوتی، وہ جو کام کرتیں بے تحاشا، ہنس رہی ہیں، تو دنیا مافیہا کی فکر نہیں، باتیں کرنے بیٹھیں گی تو جو جی میں آیا کہہ ڈالا، اچھے برے کی مطلق پرواہ نہ ہو گی، آنکھ مچولی کھیلیں گی تو بے تحاشا کوئی پرواہ نہ ہوگی سر پیر ٹوٹے ہڈیاں چور چور ہو جائیں، غرض ان کی ہر بات ہوگی وہ بے تحاشا، کسی سے محبت کریں گی تو فوراً امید ہو جائے گی کہ بس کل نکاح ہوا اور پرسوں سے گلچھرے، اور نہ جانے کیا کچھ شہزادی اپنی مونس و غمخوار سہیلی سے کہہ ڈالتی، اس کی گفتگو کی تان ہمیشہ کچھ اس قسم کے جملے پر ٹوٹتی "نجمہ اگر اس بے قاعدگی کا نام ہی جوانی ہے تو بھئی ایسی جوانی کو میرے سو سلام!"

اگر کبھی تماشہ کھیلنے کی فرمائش ہوتی تو شہزادی کی پہلی شرط یہی ہوتی کہ کوئی لڑکا نہ ہوگا۔ اور جب اس کا کوئی ماموں زاد یا چچا زاد بھائی زبردستی کھیل میں شریک ہونا چاہتا تو وہ غصہ سے سرخ ہو جاتی "احمد تمہارا یہاں لونڈیوں میں کیا کام ہے، جاؤ لڑکوں کے ساتھ کھیلو، یہ آج کل کے لڑکے ہیں" "گھر گھسے کہیں کے، ہم نہیں تمہارے ہاکی فٹ بال میں شریک ہوتے" اور پھر چشم زدن میں تاش کے پتے بکھرے بکھرے نظر آتے...... اور وہ لپک کر ایک عجیب قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا ہو جاتی، بعض اوقات وہ زیادہ بے بس ہو جاتی تو پلو سے منہ ڈھانک کر خوب روتی،-

ادھر حامد سے تو اسے خدا کا بیر ہو گیا تھا، جب سے اس کی اور حامد کی منگنی کی اڑتی اڑتی خبر سنی گئی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے برسوں پہلے مقید کر دیا گیا ہو، اس کے خیال میں ابھی کم از کم تین برس اس کی شادی کو تھے، اس نے اس سے پہلے لاکھ مرتبہ نجمہ سے کہا، "بھئی! یہ کھٹے حامد ہر وقت اسی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں کہ میری کوکھ سے لگ کر بیٹھیں مگر میں ان کو پھٹک قریب نہ پھٹکنے دوں گی اور اگر میں نے منگیتر لڑکیوں کی طرح مصنوعی پردہ کر لیا تو یہ اور سر پر چڑھ جائیں گے ---- اس نے ایک تقریب میں جانے سے اس لئے انکار کر دیا کہ حامد صاحب بھی مدعو تھے ... اگر

امی کی جھڑکی کے موہوم سے خوف نے اسے اپنی خواہش کے خلاف کام کرنے پر مجبور کر دیا۔

وہ ایک سادہ سی شلوار اور فیروزی دوپٹہ پہن کر تیار ہو گئی اس کی امی نے اِن صوفیانہ کپڑوں میں اسے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے وہ کوئی ملزم ہو، آخر خود اس کی امی نے پوت کا بھڑکیلا جھلمل کرتا غرارہ اس کی گود میں غصہ سے پھینکا "لے اسے پہن" سوچتی رہی جیسے اسے کوئی بہت بڑی مہم سر کرنا ہے، وہ سوچتی "حامد کے سامنے اپنا جسم ہی سنبھالنا مشکل ہو گا۔ یہ ست گز اغرارہ کس سے سنبھلے گا" مگر مجبوراً اسے غرارہ پہننا ہی پڑا، جب وہ پہن چکی تو امی نے پھر غائرانہ نظروں سے اسے تولا، وہ کانپ اٹھی کہ بندوں کے بجائے کہیں جھمکوں کا حکم صادر نہ ہو جائے، پھر وہ لپک کر تانگے میں پیچھے بیٹھ گئی۔ مگر بڑی آپا کے آتے ہی اسے آگے جانا پڑا، وہیں پر حامد بیٹھا ہوا تھا، وہ سکڑی سکڑائی ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی، اس کے چشم چرانے کا انداز نہایت غیر شاعرانہ تھا، اس کی نظر میں حامد دیو سے کم نہ تھا جو اسے آن کی آن میں ہڑپ کر سکتا تھا۔

پردہ کی آڑ سے وہ بڑی مشتاق نگاہوں سے نجمہ کے اسکول کی عمارت کا انتظار کر رہی تھی، اسکول کی سُرخ سُرخ عالیشان عمارت کو دیکھ دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل پڑی اس نے بڑی آپا کے شانے کو جھنجھوڑ ڈالا "آپا یہیں نجمہ پڑھتی ہے!" نجمہ کے اسکول کی سرخ سرخ عمارت سے اسے والہانہ عشق تھا، اسی بنا پر اس کا محبوب رنگ بھی سرخ رہا، سرخ پوت کا غرارہ، بندوں میں سرخ نگ، مگر پھر اسے اس سرخ رنگ سے نفرت بھی ایسی ہوئی کہ اس نے سرخ کپڑے پھر نہ پہنے، یہ تبدیلی اس میں صرف بڑی آپا کے اولاد ہونے کے وقت سے پیدا ہوئی، اسے کئی ہفتے بڑی آپا کے ساتھ زنانہ ہسپتال میں رہنا پڑا، یہاں صرف نرسوں اور گوشت کے لوتھڑے سے بچوں کے علاوہ اور کوئی دلچسپی کی چیز نہ تھی،—— اور زنانہ ہسپتال کی دیواریں بھی تو سُرخ سرخ سی تھیں، اُف! اُسے سرخ رنگ کے تصور ہی سے جھرجھری سی آجاتی!

شہزادی کی شخصیت جذباتی جھجک اور بیباک جوش و خروش کی گھٹی گھٹی سی آمیزش کا ایک پیچیدہ نمونہ تھی، ہر وقت اپنے بارے میں سوچتے رہنے سے زندگی کی دوسری چلتی پھرتی شخصیتیں محدود ہو کر اس کے لئے صرف ڈرامہ کے کردار ہو کر رہ گئی تھیں، وہ خود کو یوں لئے دیئے رہتی، اپنے جذبات و حرکات کو اتنی اہمیت دیتی جیسے وہ خود اس زندگی کی ہیروئن ہے اور سارا عالم تماشائی، وہ حسن کی خود نمائی اور خود آرائی کی آخری چوٹی پر پہنچ چکی تھی جہاں پہنچ کر اس کی قوتِ پرواز سلب ہو گئی تھی، وہ یوں ڈر ڈر کے چلتی، یوں جھجک جھجک کے باتیں کرتی جیسے وہ سب سے خائف ہے، اس کے جذباتی ہیجان نے اسے ایک ذہنی مریض بنا کر چھوڑا، جب وہ کوئی فلم دیکھتی تو ایسا محسوس کرتی جیسے وہ خود اس کہانی کا کردار ہے، وہ بچہ کی موت پر یوں چیخ اٹھتی جیسے خود اس کا بچہ مر گیا ہو۔ اسی لئے وہ بہت متلوّن مزاج ہو گئی، اسے اس زندگی سے پرخاش تھی جس میں اسے جذباتی سکون کے بہت کم لمحے میسر ہوئے —— وہ زندگی اور ڈرامہ میں حدِ فاصل نہ قائم کر سکی، اس کا تمام تر تجسس اسی امر میں سرگرداں رہتا کہ وہ کسی طرح معلوم کر سکے کہ کہاں سے ڈرامہ شروع ہوتا اور کہاں زندگی ختم ہوتی ہے۔

وہ زندگی کے ہر نئے تجربہ کو اپنانے کے لئے تڑپتی، اسی جذبہ کے تحت اس نے نجمہ کے اسکول کے سالانہ ڈرامہ میں حصہ لینے کی حامی بھر لی تھی۔ اس نے اپنا پارٹ بہت جانفشانی سے یاد کیا تھا، بعض اوقات تو وہ مکالموں کو اکیلے میں دہرا کر بھی شرما جاتی، —— لیکن جب اس نے اسکول کا اودھم دیکھا تو وہ دل چھوڑ گئی، اس نے نجمہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ڈرامہ میں حصہ نہ لے سکے گی، مگر نجمہ نے جب ہاتھ پیر جوڑے تو وہ پھر راضی ہو گئی حالانکہ اس اثبات کا ردِ عمل پھر نفی میں شروع ہوا۔ اس نے ہانپتے ہوئے دل ہی دل میں دہرایا "میں اسٹیج پر نہیں جا سکتی"۔

وہ ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ کئی لڑکیاں اسے گھسیٹ کر لے گئیں، کسی نے اس کا لباس تبدیل کرانے کے لئے دوپٹا کھینچا تو اُس نے کشتی سی لڑی، پھر کسی نے اس کے منہ پر خوب سا پوڈر مل دیا۔ تو کسی نے اس کے لپ اسٹک لگا دی، اسے اپنی اس درگت پر رونا آ رہا تھا—— وہ یونہی مبہوت کھڑی تھی کہ گھنٹی بجی اور اسے اسٹیج پر دھکیل دیا گیا، وہ اسٹیج پر گھبرائی گھبرائی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، وہ بھونچکا سی تھی کہ آخر کہاں چھوڑ دی گئی، —— استانیاں اور لڑکیاں اس کی اس

اعلیٰ اداکاری پر آپس میں تبصرہ کر رہی تھیں —— وہ ابھی اس تحیر آمیز فضا کو اچھی طرح اپنانے بھی نہ پائی تھی کہ ناگہاں ایک طرف سے ایک خوب صورت اور تنومند مرد آتا نظر آیا، وہ تو غیر مرد کی پرچھائیں سے بھی پردہ کر لیا کرتی تھی اسی لئے وہ چیخ اٹھی وہ مرد بولا۔ "جانِ حیات گھبراؤ نہیں میں ہوں، تم لونڈی ہو تو کیا تم کو ہی اس عالیشان محل کی ملکہ بناؤں گا ......" وہ نجمہ کو اس بھیس میں پہچان کر مسکرائی، آنسو میں گھلا ہوا اس کا خفیف تبسم جذباتی اداکاری کا معراج تھا، استانیاں تعریفیں کرتے کرتے تھک سی گئی تھیں، پھر اس جوان نے یہ کہکر "آؤ چاند کی ملکہ آج دریا کے کنارے ہم محبت کے وہ ابدی نغمے چھیڑیں جن سے کائنات بھی جھوم اٹھے"۔ اسے اپنی آغوش میں گھسیٹ لیا۔ اور شہزادی نے اس سردر آگیں لمس کی گرمی سے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں بند کر لیں —— ہال تالیوں سے گونج اٹھا مگر شہزادی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اسکے طمانچے پڑ رہے ہوں، اس نے ایک جھرجھری سی لی، آج اس کی ماں اسے ضرور مارے گی اور اگر کہیں نجمی کی ماں کی طرح اس کے سینہ میں چٹکی لے لی تو کیا ہوگا؟

اس دن کے واقعہ نے اس کی نس نس میں ایک نامعلوم سی بجلی بھر دی تھی، اس نے ہزاروں مرتبہ اپنے کان پکڑے کہ اب وہ کبھی ڈرامہ میں حصہ نہ لیگی، اس نے نجمہ سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دیا، وہ اس سے بہت خائف تھی، پھر اسے امی سے جو ڈر لگتا تھا کہیں وہ یہ نہ کہدیں کہ تو اتنی بری لڑکیوں سے کیوں ملتی ہے، حالانکہ امی نے لاکھ بار اس سے اصرار کیا کہ وہ نجمہ کو کیوں نہیں بلاتی۔

وہ نجمہ سے جھگڑ کر بہت ملول تھی، دراصل اس کی دوستی نجمہ سے اور زیادہ مستحکم ہو گئی تھی مگر وہ اس سے لڑائی کر کے ایک ڈھونگ سا رچائے ہوئے تھی، جاڑے کی راتوں کی گرم گرم تنہائی میں جب وہ بری طرح نجمہ کی غیر موجودگی کو محسوس کرتی تو وہ اضطراری طور پر نہ جانے کیا کیا بک جاتی "میں اب نہ ملوں گی اس چڑیل سے" ——

بغیر کسی کے کہے شہزادی نے زینہ کا قفل کھول دیا — اب وہ پھر لڑکیوں کی دھم دھم سن رہی تھی، بے تحاشا بھاگ دوڑ، قہقہے، اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کے سینہ کو کھوند رہا ہو، اس کی چھاتی کو بڑی بیدردی سے مسل رہا ہو .....

سب کی دیکھا دیکھی وہ بھی چھم چھم "سنکر بے تحاشا بھاگی، پیر لڑکھڑائے اور وہ پیر حسیلوں پر پھسلی، اسکے تو نہ چوٹ آئی، نہ کوئی خراش، سب کی سب بند چوٹ تھی، سرخ سرخ کھال میں سے نیلا نیلا خون جھلک رہا تھا، وہ دبی دبی آواز میں "نجمہ، نجمہ" کہکر کراہ رہی تھی۔ "ارے مردار کہاں کہاں چوٹ آئی" امی کرچھے میں ہلدی لئے پوچھ رہی تھیں۔ اور وہ یوں گم سی تھی جیسے کہنا چاہتی ہو کوئی ایک جگہ ہو تو بتاؤں!"

بقیہ آشیانہ صفحہ ۲۷ سے آگے

تھی۔ پھر بھی لوگ سراسیمہ باہر کھڑے ہوئے صرف اتنا بار بار سنتے رہے۔

"نہیں نہیں شہناز، تو فتنہ پرور نہیں ...... جھوٹ .... دروغ ...... فریب ..... تو چڑیل ہرگز نہیں ...... تو ایک وفا شعار و وفا پرست بیوی تھی .... تجھے نذر آتش کبھی نہیں کیا جا سکتا ...... نہیں نہیں، میں تجھے کبھی نہیں جلنے دوں گا۔ ..... شہناز! تو اب بھی میرے دل کی پہنائیوں میں جلوہ فگن ہے .... تو رونق آشیانہ ہے ——

ہاں!!

تو زندہ جاوید ہے ... — — —

نوٹ:۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ اور جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ لکھیں۔

ابو سعید قریشی

سیر بین

دِلی دیکھی دلی والے دیکھے، گورے دیکھے کالے دیکھے.....!
مغلوں کے محل دیکھے، افرنگی کے تاج دیکھے۔ دلی کی گلیاں دیکھیں
رائے سینا کے دائرے دیکھے، ایک ایک اینٹ کے تھیٹر دیکھے، ایئر
ریڈ ریہرسل دیکھے۔ آہنیا کی جوالا دیکھی، پیلی کوٹھی میں پلٹنیں دیکھیں
دکٹری پیریڈ دیکھی، پولیس کی ہڑتال دیکھی۔ لیگ کی کنوینشن Con-
-vention دیکھی، الا اللہ کی لہر دیکھی۔ برلاجی کی پیکر ڈ میں گاندھی
جی کی آمد دیکھی، پریر (Prayer) کا پنڈال دیکھا۔ پنڈال کے
اندر بھی دیکھا پنڈال کے باہر بھی دیکھا، درشنیوں کے جمگھٹ دیکھے
چاٹ کے خالی دونے دیکھے۔ اور صاحبو کیا بتاؤں کہ ان آنکھوں
نے کیا کیا نہ دیکھا۔ یوں دیکھتے دکھاتے پورے پانچ سال
(مبالغہ صرف سات ماہ کا ہے) بیت گئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ
بڑے مزے میں بیتے۔ رہنے کو ایک معقول مکان، کم حیثیتی کے باوجود
گھر پہ ایک خدمتگار۔ ہر مہینے پچاس ساٹھ روپے دوست احباب
سے قرض لیتا اور تنخواہ ملنے پر اتار دیتا۔ قرضہ بڑھ گیا تو گھر پہ چھوٹے
بھائی کو لکھ بھیجا کہ "یہاں سخت بیمار ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے۔ کہ
اگر باقاعدہ علاج نہیں کروگے تو جانبر نہیں ہو سکوگے۔ لیکن یہاں ہر
کھانے کو بھی کچھ نہیں علاج تو درکنار۔ تم جانتے ہو جنگ کا زمانہ
ہے سوا پانچ روپیہ سیر کا تو گھی مل رہا ہے (ویسے میں بناسپتی ہی استعمال
کر رہا تھا) احباب سے کب تک قرض لوں گا، اب تو ان سے آنکھیں
ملاتے بھی شرم آتی ہے ..... وہ جو بھنگیوں کی بستی میں مکان ہے
نا اسے بیچ ڈالو..... تمہیں نے تو لکھا تھا کہ کرایہ دار نہیں ٹکتے، اب
موقع ہے۔ سننے میں آیا ہے۔ کہ منڈی تیز ہو رہی ہے!! غرضیکہ ایسے
ہی حیلے حوالوں سے گاڑی چل ہی رہی تھی۔ اپنے لئے تو یہی بہت تھا کہ
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں...... کبھی کبھار عیاشی
کی سوجھی تو جامعہ مسجد جا پہنچے، آٹھ دس آنے کی کتابیں کباڑیوں کے یہاں
سے خریدیں اور گھر لا کر انہیں بانس کے بک کیس میں سجا دیا۔ ہفتے عشرے
شاہد صاحب کے یہاں بلائے بن بلائے جا دھمکے اور محفل موسیقی کا رنگ دیکھا۔
کبھی کسی صاحب نے بے بجے دھنی شروع کی تو حاضرین پر اپنی موسیقی
دانی کا رعب جمانے کے لئے کہہ دیا کہ صاحب یہ بھی عجیب راگ ہیں۔
گانا ذرا چونکا تو بن گیا غارا۔ خیر کچھ تانیں کھائیں کچھ کھانا کھایا اور
اجازت لے کر گھر پہنچے۔ بیوی سے کہا دفتر میں دیر ہو گئی اور لحاف اوڑھ
کر سو رہے۔ گاہے ماہے فلم دیکھنے کا دھیان آیا تو ہفتے کے
روز نئی دہلی کا رخ کیا ——— Matinee سے ایک گھنٹہ پہلے
بکنگ آفس کے سامنے ڈٹ گئے۔ اور ۹ روپے میں ۱۲ کا لطف اٹھایا۔
مگر صاحب یہ سب باتیں اب ہوا ہو گئیں۔ ایک روز بیٹھے بٹھائے
سر میں لاہور کا سودا سمایا۔ پنجاب کا پیرس۔ پریوں کے پرے اور
پری جمالوں کے جھرمٹ آنکھوں کے آگے جھوم گئے دل نے کہا دلی میں
یہ بات کہاں؟ دلی کے وہ کوچے جنہیں میرؔ نے اوراقِ مصور کہا
تھا اب انہیں دیمک چاٹ چکی۔ چاوڑی بھی اپنی پہلی جگہ سے اٹھ
گئی اور وہ مسجد کے زیرِ سایہ خرابات والی بات بھی گئی۔ اور یوں
بھی وہ زمانے لد گئے جب شرفا طوائفوں کے یہاں آنا جانا باعث
شرف سمجھتے تھے۔ چہ جائے کہ ایک بیچارا کلرک ادھر کا رخ
کرے۔ جو کہیں بڑے صاحب ہی بھولے چوک سے ادھر کو آ جائیں تو
ساری تماشبینی ختم، دال روٹی بھی گئی۔ شاعر ہم نہ ہوئے، پیشۂ آبا
سپہ گری، پیشہ ما کلرکی، قصیدہ خوانی سے بھی نجات کی صورت نہ رہی۔
اب تو لاہور ہی چلو بھائی ——— کسی کی منت کی، کچھ خرابیٔ صحت کے
جھوٹے سچے بہانے بنائے۔ کچھ کہا کہ حضور آبائی جائداد کا ستیاناس
ہو رہا ہے۔ منیم کرایہ لے کر بھاگ گیا ہے۔ زمینوں پر مزارعوں نے
بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔ جس بنک میں ہمارا روپیہ ہے اطلاع ملی ہے
کہ اس کا دیوالہ نکل رہا ہے..... اور اب تو ہمارے بچاؤ کی صرف

ایک ہی صورت ہے کہ ہمیں لاہور بھیج دیجئے، بندہ حضور کے مائی باپ اور بال بچوں کو دعائیں دے گا۔...... اور حالانکہ ہمیں اپنی خوش گفتاری پر کبھی ناز نہیں رہا لیکن ہماری باتوں کا جادو چل ہی گیا۔ اور ایک روز ہمیں وہ خط موصول ہؤا جس کا ہمیں بیتابی سے انتظار تھا۔ حکم تبادلہ — اور ہم اس حکم نامہ کو یوں لئے لئے پھرے جیسے شاعر کا رقیب محبوب کا خط سینے سے لگائے سر بازار پھرتا ہے۔ اور یوں جب ہمارے جانے کی خبر ایک جہان کو ہوگئی تو ہم نے باری باری سب سے اجازت چاہی۔ چھوٹے صاحب نے اس دن ہمیں ایک سگرٹ بھی پلایا۔ اور بڑے صاحب نے اس امید کے ساتھ ہم سے ہینڈ شیک کیا کہ ہم اپنے نئے دفتر میں زیادہ تسلی بخش کام کریں گے اور ان تمام سیاہ دھبوں کو دھو ڈالیں گے جو ہمارے دفتری نامۂ اعمال پر نظر آ رہے تھے ...... اور یوں ہم لاہور روانہ ہوئے، لاہور جہاں ہماری طالبعلمی کا زمانہ فیل ہو ہو کر کالج بدلتے گذرا تھا۔ جہاں ہم نے چپ چاپ "لبوں پر مہر خاموشی دلوں میں یاد کرتے ہیں" کے مصداق اپنی ہم جماعتوں سے عشق حقیقی کا دم بھرا تھا' اور خاموش اندھیری راتوں میں آپ سے آپ اس خیال پر جھوم گئے تھے کہ سب کی سب ہم پہ مرتی ہیں۔ حالانکہ انہیں ہماری موجودگی کا اتنا بھی علم نہیں تھا جتنا کہ آنکھوں میں کاجل کا احساس — لاہور جہاں ہمارے ہم جماعت سائیکلوں پر تانگوں کا پیچھا کرتے، اور ہم دور کھڑے مسکاتے، ان کے کارناموں پر خوش ہوتے۔ جیسے وہ ہمارے ہی کمالات ہوں .... لیکن لاہور آتے ہی سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہؤا کہ کہیں سر چھپانے کو جگہ ملے۔ جو احباب ہمیں یہاں آنے پر بہکار رہے تھے ان سے کہا کہ لاؤ بھئی کوئی مکان دلواؤ تاکہ ہم بھی لاہور سے مستفید ہو سکیں۔ جواب ملا دلی سے آئے ہو یا آگرہ سے (خیال رہے کہ آگرہ میں تاج محل کے علاوہ ایک پاگل خانہ بھی ہے) کسی نے کہا یہ بھی کوئی مکانوں کا موسم ہے اب تو Post War Housing Scheme کا انتظار کرو۔ Stream Lined مکانوں کا بندوبست ہو رہا ہے۔ بس تمہیں تھوڑا صبر کرنا ہوگا۔ سکیم کے ارباب بست و کشاد میں کچھ اختلاف رائے ہوگیا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری آب و ہوا کے لئے وہی پرانے مغلئی محرابوں والے مکان ٹھیک

ہیں، کچھ کرتا دھرتا یہ کہتے ہیں کہ تمہیں بھارت ورش کی پراچین کلاؤں کو بھی دھیان میں رکھنا ہوگا۔ تاہم یہ وقتی باتیں ہیں، جیسے ہی ٹھیکوں کا تسلی بخش انتظام ہوگیا کام فوراً شروع ہو جائے گا۔ تم اپنا نام رجسٹر کروا دو مکان مل جائے گا — مجبور ہو کر اپنے محکمہ والوں کے پاس گیا اور دھمکی دی کہ حضور اگر بندہ کو مکان نہ ملا تو دفتر کا کام ہونے سے رہا۔ لیکن اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہؤا۔ اس پر ہم نے کچھ نئی تحریکوں کا حوالہ دے کر کام نکالنا چاہا اور کہا جس مزدور کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہ ہو وہ کیا کام کرے گا مکان دو ایسے نہیں یہ رکھا ہے قلم۔ اس پر محکمہ نے میرا مطلب ہے کہ افسر نے کاغذات سے نظریں اٹھائیں اور ہماری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا گویا یہ کہہ رہا ہے کہ صاحبزادے اپنی اوقات پہچانتے ہو؟ ابھی جمعہ جمعہ پانچ سال تمہیں نوکری کو ہوئے ہیں اور یہ گیدڑ بھبکیاں! سرکاری کاغذات میں تمہارے نام کے ساتھ اب بھی Temporary لکھا ہؤا ہے۔ میاں جنگی اڈیشن تم ہو کس شمار میں۔ اپنے لکھاری ہونے پہ ناز ہوگا! لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ دفتری کاروبار میں شعر و ادب کو کوئی نہیں پوچھتا! ٹکے سیر بک رہے ہیں تمہارے بھائی بند۔ چار آنے میں غزل لکھوا لو .... کچھ ہوش کی دوا کرو، آئندہ جو کبھی دھونس دی تو بیٹھے بٹھائے نکال دوں گا پھر کہو گے صاحب نے غریب مار کر دی۔ مکان ڈھونڈ دو نواب صاحب کو! ہم خود تمہاری تنخواہ سے چھ گنا رقم دے کر ہوٹل میں رہتے ہیں، تمہیں مکان کہاں سے دلوائیں — بس صاحب ساری شیخی کرکری ہو گئی۔ وہ جو محاورہ ہے نا، کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، بس وہی حال تھا — اتنے میں بیوی کا خط ملا — بیرنگ — لکھا تھا کہ دیورانی بہت وندنا رہی ہے' جٹھانی نے الگ ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرتا کہتی ہیں تم تو ماشاءاللہ سے دلی والی ہوئیں ہم اس اہل کہاں کہ تم سے بات کر سکیں ..... تمہارے بچے ہمارے بچوں کی زبان نہیں سمجھتے — مختصر یہ کہ فوراً مکان کا بندوبست کرو نہیں ہمارا مہر تیار رکھو — خط کو جیب میں ڈالا اور قہوہ خانہ کے Intelligentzia سے لے کر اس تنور کے "تانگوں والوں تک' جہاں ہم کھانا کھاتے تھے'

اپنی بپتا بیان کی لیکن کسی کا دل نہ پسیجا۔ بلکہ لوگ باگ اُلٹے ہنس دیئے اور پوچھنے لگے کہ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ اس مفلسی میں ہمیں میر کی بہت یاد آئی اور ہم دل ہی دل میں گنگنانے لگے ؎ "کیا بود و باش پوچھو ہو پُورب کے ساکنو"۔ کچھ صاحبوں نے کہا کہ میاں اتنی جلدی گھبرا گئے تمہاری بیوی اگر رشتہ داروں سے نالاں ہے تو اس میں ایسی نرالی بات تو کوئی نہیں کہ تم ہم سے ہمدردی کی امید کرو۔ سوائے باوا آدم کی بیوی کے سبھی بیویاں اپنی دیورانیوں اور جٹھانیوں سے جلتی رہی ہیں ..... جاؤ سامنے کی سبیل سے ٹھنڈا پانی پیو اور مکان کا دھیان دل سے نکال دو۔ مگر یہاں تو لگن لگی تھی۔ گلے گلی کوچوں میں گھومنے، لیکن آنکھیں تھک گئیں TOLET کا بورڈ نظر نہ آیا۔ ہوتے ہوتے سمجھ میں آیا کہ یہ بھی بلیک مارکیٹ میں پہنچا! ۔ چنانچہ چور بازار کا اتہ پتہ پوچھنا شروع کیا اور مثل حاتم کے جسے جن کی جان لینے کے لئے سات منزلیں طے کرنا پڑی تھیں، ہم بھی ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کا پتہ پوچھتے ایک مکان دار کے پاس پہنچے۔ معلوم ہوا کہ حاجی ہیں اور نیبائل کا کارخانہ ہے۔ پرانی موٹروں کو نیا بنا کر بیچتے ہیں۔ اور ضرورتمندوں کی جائداد خرید کر ان کے آڑے آتے ہیں ـــــ دروازے پر دستک دی۔ اوپر سے آواز آئی "کون ہے؟"۔ ہم نے الفاظ کے مخارج کا خاص خیال رکھتے ہوئے "حاجی" کی "ح" کو "ہ" اور "خ" کے درمیان ادا کیا اور کہا۔ حاجی صاحب تشریف رکھتے ہیں؟ جواب ملا روٹی کھا کر آتا ہوں۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد زینے میں بھاری بھرکم قدموں کی آواز سنائی دی اور ایک صاحب توند پر ہاتھ پھیرتے ڈکارتے نمودار ہوئے۔ ہم نے عربی لہجہ میں کہا۔ اسلام علیکم۔ جواب ملا۔ والیکم۔ افسوس ہوا کہ ہم نے خواہ مخواہ اپنے حلق کو تکلیف دی۔ خیر مطلب کی بات چھیڑی۔ سننے میں آیا ہے کہ آپ کا فلاں روڈ والا مکان خالی ہے۔ جواب ملا، ہاں ہاں خالی تو ہے۔ لیکن ـــــ ہم نے پوچھا لیکن؟ بولے پگڑی کا تو تمہیں پتہ چل ہی گیا ہوگا! پانسو دیدو اور چابی لے جاؤ۔ ہم نے غربت کا عذر پیش کیا۔ جواب ملا۔ امیری غریبی تو اللہ کی دین ہے ویسے میں نے تمہاری خاطر پہلے ہی کافی رعایت کر دی ہے ورنہ آج کل تو سال بھر کا کرایہ پیشگی لیا جاتا ہے۔ ایسے

میں ہماری دال کیا گلتی یہ کہکر اجازت چاہی کہ سوچکر جواب دوں گا۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ اسی روز ایک مشہور ادبی ماہنامہ کے مدیر سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ پانچ برس بعد ہماری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ اخاتو آپ آگئے اپنے وطن میں اب بسم اللہ کر کے ایک افسانہ دلوایئے۔ بہت زیادہ عریاں نہ ہو۔ میں نے عرض کیا۔ پیرو مرشد بندہ خود ہی حاضر ہے، دفتر میں لے چلئے، چھپنے کی بھی خواہش نہیں سر چھپانے کو جگہ ـــــ تو مل جائے گی کم ازکم۔ ہمارے مدیر دوست کی گول گول آنکھیں عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے گھومیں اور سر کے بال اور بھی سیدھے ہوگئے جیسے ان کے سر سے بجلی کی کوئی رو گذری ہو۔ سوال ہوا۔ تو مکان نہیں مل رہا؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ اردو کی قسمت! خیر کوئی نئی نظم سنایئے۔ نہ جانے پہلی بات کا اثر تھا یا دوسری کا ہمارے شاعر مدیر نے کہا۔ مکان کا بندوبست ہو جائے گا۔ میں اپنے موجودہ مکان سے اٹھ رہا ہوں اس میں آپ چلے آیئے۔ لیکن افسانہ والی بات نہ بھولئے آئندہ شمارہ کے مضامین کے سلسلہ میں اس کا اعلان کر رہا ہوں ـــــ اور یوں مجھے وہ مکان ملا جس میں آجکل میں زندگی کے دن بسر کر رہا ہوں ـــــ ادب کی دلالی میں یہ ہمیں پہلا فائدہ پہنچا ہے ـــــ تین کمروں کا ڈربہ جس کے غسلخانہ میں نل نہیں اور باورچی خانہ میں چمنی نہیں۔ ایک سچ مچ کا بلیک ہول جس میں سورج کی روشنی اور ہوا دونوں پر قدغن ہے۔ (اف ری غریبی ہائے زمانے) بارش میں میر کے گھر کا حال اس سے کچھ بہتر ہی ہوگا۔ جتنا دھواں اس گھر میں ہم نے پیا ہے شاید ہاروت ماروت کے پھیپھڑوں میں بھی نہ گیا ہو۔

دفتر سے جو وقت بچ رہتا ہے مکان کی بالکونی میں کٹتا ہے۔ یہاں یہ بات بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مکان کا نقشہ چاہے کچھ سہی۔ ایک بات ضرور ہے اور وہ ہے اس کا حدود اربعہ اور محل وقوع یعنی کہ پتہ بڑا رعب دار ہے ـــــ لارنس دو منٹ کا راستہ۔ چڑیا گھر چار منٹ کا۔ لاٹ صاحب کی کوٹھی سات منٹ کا ـــــ اس لئے سڑک خوب چلتی ہے، سیر اور صحت کو لازم و ملزوم سمجھنے والوں کی ٹولیاں یہاں سے گذرتی ہیں۔ موٹروں پر، فٹنوں پر، سائیکلوں پر،

تانگوں پر اور ٹانگوں پر۔ توندیل سیٹھ اور گول مول سیٹھانیاں فٹنوں کی سکہ بند سواریاں ہیں۔ سائیکلوں پر اکثر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا گذر ہوتا ہے (البتہ ایک بات اس بارے میں میں نے ضرور محسوس کی ہے کہ آج سے دس برس پہلے کی بہ نسبت سائیکل سوار صاحبزادیوں کی گنتی کئی گنا زیادہ ہے) —— تانگوں کی سواریوں کے چہرے چھت کی وجہ سے اچھی طرح دکھائی نہیں دیتے، اگر کچھ نظر آتا ہے تو یہ سلمہ لگی ساڑیوں کے پلو، مقیشی دوپٹوں کے آنچل، کالے کالے برقعوں سے نکالی ہوئی گوری گوری کلائیاں اور مہندی لگے ہاتھ، لال لال شلواروں کے مطلا پائنچے اور ان سب کے ساتھ نئی پتلونوں والی ٹانگیں اور تازہ جوتوں والے پانو —— سب سے زیادہ دلچسپ وہ لوگ ہیں جو ٹانگوں پہ سواری کرتے ہیں۔ دو ہم جنسوں کا ایک جوڑا سیر میں سب سے زیادہ باقاعدہ ہے۔ ایک صاحب ترکی ٹوپی پہنتے ہیں اور دوسرے بزرگ کرسٹی کے قائل ہیں۔ دونوں کے ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی لکڑیاں ایک شارٹ کوٹ شلوار اور ٹائی کے پابند ہیں اور دوسرے بند گلے کا کوٹ تنگ پائنچوں کا پائجامہ پہنتے ہیں۔ ایک کی داڑھی حنائی ہے اور دوسرے کی مونچھیں خضابی۔ سن میں دونوں ساٹھ سے اوپر ہوں گے، پنشن خوار معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں بزرگ ہر روز میرے مکان کے سامنے پہنچ کر اپنی اپنی گھڑی نکال کر وقت دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد نسوار کی ڈبیاں نکلتی ہیں، کچھ منہ میں ٹھونسی کچھ ناک میں۔ دو چار چھینکیں لی۔ پانچ چھ کھنکار پھینکے اور چل دیئے۔

ان کے کچھ دیر بعد ایک سائیکل سوار کا گذر ہوتا ہے جن کے پیچھے کیریئر پر ایک برقع پوش خاتون —— غالباً ان کی بیوی —— نظر آتی ہیں۔ یہ جوڑا کچھ اس تیزی سے گذرتا ہے جیسے کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ اگر راہگیر زیادہ ہوں تو سائیکل کی رفتار اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ برقع پوش خاتون اونچی ایڑی کی گرگابی پہنتی ہیں۔ ان کی سائیکل کسی شوقین مزاج تانگے والے کے گھوڑے کی طرح سجی ہوتی ہے۔ آئینے اور ریفلیکٹر اور کاغذ کے پھول۔ غرض کہ مڈگارڈز سے لے کر ہینڈل تک اور فریم سے لے کر ہبز تک سائیکل ایک مقفا نظم نظر آتی ہے۔

آج کل کوئی ساڑھے نو کے قریب میرے گھر کے سامنے سے ایک دیسی میم کا گذر ہوتا ہے۔ دو گرانڈیل کتوں کے ہمراہ وہ بھی غالباً سیر کو جاتی ہیں۔ عمر جوانی کے اس طرف، چہرے پہ زردی، ہونٹوں پہ لالی، ہاتھ میں ہنٹر۔ لباس کبھی ساری، کبھی Slacks کبھی شلوار۔ کتے کہا نہیں مانتے۔ ہم جنسوں کو دیکھ کر سگ مستیاں کرتے ہیں۔ اس پر میم صاحبہ بڑی برہم ہوتی ہیں۔ دیوانہ وار ان کا تعاقب کرتی ہیں اور چلاتی ہیں۔

"You dogs! you brutes, why dont you behave? Come here! Come back! else I give you a beating".

صبح نو بجے کے بعد میرے ڈربے کے سامنے اچھا خاصا کچہری کا سماں ہوتا ہے —— میرے گھر میں تو فقط دھوپ، ہوا اور پانی کا ہی راشن ہے۔ مگر مکان کے سامنے گیہوں، چینی اور چاول کا راشن ڈپو ہے —— اس ڈپو کے سامنے بڑی بڑی کاریں بھی آتی ہیں اور ان سے بڑے بڑے لوگ بھی اترتے اور ان کے یا ان کے نوکروں کے پاس بڑے بڑے تھیلے بھی ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں چھوٹے چھوٹے لوگ بھی آتے ہیں، جن کے ہاتھوں میں کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں، یا پیٹھ پر چھوٹی چھوٹی بوریاں —— کئی بار زرزمین کی سرکار صنفت کی طرف سے یہ مساوی تقسیم عجز و انکسار اور شکر و تحسین کے احساس سے دوپٹوں اور اوڑھنیوں کے پلوؤں میں بھی وصول کی جاتی ہے۔ کئی باریوں بھی ہوتا ہے کہ کسی مجبوری مثلاً رسائل باربرداری کی مشکلات یا راشن ڈپو والے کے پاس روپے ختم ہو جانے کی وجہ سے راشن کا چھکڑا وقت پر نہیں پہنچتا۔ ہاں یاد آیا اس تاخیر کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ گاڑی بانوں کی گھڑیاں خراب ہوں، بہرحال ایسے میں بلکتے بچوں کو بہلاتی ماؤں تک کو میں نے پہروں راشن کا انتظار کرتے دیکھا ہے —— سننے میں آیا ہے کہ راشن ڈپو والے نے اپنا ایک ہوٹل بھی کھول رکھا ہے لیکن مجھے اس سے کیا یا آپ کو اس سے کیا؟ وہ چاہے ایک چھوڑ دو ہوٹل کھولے، اگر اس کا تول ٹھیک ہے اور اگر ہمیں دو چار گھنٹے کے انتظار کے بعد بھی راشن مل جاتا ہے تو ہمیں کسی سے کیا۔ بقول ایک غیر پنجابی کے "حضت ہم کو تو راتب چاہیے راتب" مجھے بھی اپنا راشن لینے کے لئے خود ہی جانا پڑتا ہے۔ اور اب کے

ہمیں زندگی میں پہلی بار اس بات کا احساس ہوا ہے کہ راشن کھانے کی بہ نسبت راشن اٹھانا کسقدر مشکل ہے۔ ہوا یہ کہ اس بار کوئی مزدور نہ مل سکا اور ہم ٹھہرے لکھنے پڑھنے والے لوگ اب راشن گھر تک کون پہنچائے؟ — ایک نظر راشن کی بوری پر ڈالی اور پھر رحم طلب نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا لیکن کسی کا دل نہ پسیجا۔ اس لئے ہم نے آرٹ سے کام لینا چاہا اور نہایت محنت سے چہرے پر یتیمی کے آثار طاری کئے۔ نہ ہوا کوئی ڈرامہ کار سیانہیں تو جھوم جاتا اور راشن کے ساتھ خود ہمیں بھی اٹھا دیا اٹھوا کر گھر پہنچا دیتا لیکن وہاں لوگوں کو آرٹ کی بہ نسبت گندم کے سنہری دانوں سے زیادہ دلچسپی ہو رہی تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا ہمت کو آواز دی، حوصلے کو پکارا، دل ہی دل میں "انقلاب زندہ باد!" اور چند ایک نئے نعرے لگائے۔ خود کو ڈلیک پر بیٹھنے والا مزدور تصور کیا، چھاتی میں ہوا بھری، شانوں کو جھٹکا دیا اور ٹانگوں کے بیچ بوری لٹکا کر یوں چلنا شروع کیا جیسے ٹانگیں کمان ہو گئیں ہوں۔ لیکن فوراً احساس ہوا کہ خالی خولی نعروں سے انقلاب صرف شعر و سخن اور کاغذ تک ہی محدود ہے۔ اور یہ لوگ باگ جو بازاروں میں رنگارنگ کے جھنڈے لئے بھانت بھانت کی آوازیں نکال رہے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک سوانگ سے زیادہ نہ سمجھو۔ ہم ایسے جو نیس پنتیس سیر وزن نہ اٹھا سکیں انہیں کبھی انقلاب کا نام نہیں لینا چاہیئے۔ اس وقت غالب کا وہ شعر بہت یاد آیا ؎ غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج ......" اور ہم نے دل ہی دل میں کہا کہ صاحبزادے اللہ میاں کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایک ایسے ملک میں پیدا کیا جہاں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں اور طاقتور کو کمزور پر ہنسنے کا بھی حق نہیں، اگر وہ ایسا کرے تو ازالۂ حیثیت عرفی ادا کرے، اور یوں قانون نے تمہیں جینے کا حق دے دیا ہے۔ خیر گذری جو کہیں ایسے ملک میں نہیں پیدا ہوئے جہاں جینے کے لئے جسم میں لہو کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ اس وقت تمہارا شمار 'معذوروں' میں ہوتا — خیر اس گرمی سردی میں ہم سڑک پار کر گئے۔ کیسے؟ یہ نہ پوچھیے۔ اب اور آگے جانے کا دم نہیں تھا۔ اتنے میں حلوائی کا لڑکا، جو ہمارے دودھ دے جاتا ہے۔ ہماری مدد کو پہنچا۔ ہم نے دبی ایک بار دبی دبی آواز میں نہیں نہیں کہا۔ اور پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ سچ مچ ہٹ پیچھے نہ ہٹ جائے، اس کے باوا کے سر پر احسان کرتے ہوئے کہا۔ اچھا بھئی تمہاری مرضی۔ اور کیا دیکھتا ہوں۔ کہ اس سولہ سترہ برس کے لونڈے نے ایک ہی جھٹکے میں بوری پیٹھ پر پھینکی اور سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔ اور ہم اپنی گئے سال کی مخملی پتلون جھاڑنے میں مصروف ہوئے۔ اس پتلون کا قدرتی رنگ فاختئی تھا لیکن متواتر استعمال سے مردہ چوہے کی کھال بن گئی تھی۔ چنانچہ نیلا رنگ دلوانا پڑا اور اب اسے سفید پٹی کے ڈبل بریسٹ کوٹ کے ساتھ (بطور امریکی ڈریس سوٹ کے) صرف شام ہی کو پہنا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو یہ پتہ نہ چل سکے کہ وہ کہاں کہاں سے خارش زدہ کتے کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ 'کتے' سے مجھے ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ کچھ دن ہوئے میں کسی بہانہ دفتر نہ گیا تھا۔ ایسے میں خیال آیا کہ کچھ لکھا جائے۔ چادر کی بکل مار مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ ہاتھ میں قلم سامنے کاغذ لیکن لکھوں تو کیا لکھوں۔ نہ مناسب مکان نہ موزوں فضا، خیالات آئیں تو کہاں سے؟ دفعتاً خیال آیا کہ سبھی لکھنے والوں کا یہی حال رہا ہے، تم کوئی نرالے نہیں ہو۔ میکسیم گورکی ہی کو لو، اس کی بہترین کہانیاں اسی زمانہ کی تخلیق ہیں۔ جب اسے کھانے کو روٹی میسر نہ تھی اس کے دن جہاں گردی میں کٹتے تھے اور رات کسی پتھر کی اوٹ میں یا کسی جھونپڑے کی چھت تلے۔ اور کئی ایک جن کی تحریریں آج آسمانی صحیفوں سے کم نہیں سمجھی جاتیں۔ جن کی یاد میں میونسپلٹیاں سڑکوں کے نام رکھتی ہیں۔ اور مسجد دنا بنتے ہیں تاکہ ان کی اولاد انہیں فاتحہ دے اور اپنے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کرے کہ اس نے انہیں اپنے نفس امارہ کو مارنے کے اسباب بہم پہنچائے اور انہیں سر اونچا نہیں کرنے دیا .... اور یوں سوچتے سوچتے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مصنفی کو مفلسی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ فن اور فاقہ ہماری سماج کے حساب سے لازم و ملزوم ہیں۔ اصلی فنکار وہی ہے جو خود فاقوں مرے اور اس کے پبلشر پریس لگوائیں اور بلڈنگیں بنوائیں۔ اور جب یہ حقیقت ہی ٹھہری تو فرار کیوں — منطق بڑی پرزور تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خیالات کی ہڑتال ختم ہو جائے گی اور میرے سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر ابھی ایسے افکار کی بارش ہو گی جو میرے مرنے کے بعد موتیوں کے تول بکیں گے اور میری تمام اخلاقی کمزوریوں کے باوجود

مجھے حضرت، اور رحمتہ اللہ علیہ بنا دینگے۔ میں ابھی انہی خیالات کے مزے لے رہا تھا۔ کہ بازار کے کتے کچھ اس انداز سے بھونکے جیسے کوئی بہت بڑی آفت آگئی ہو۔ ساتھ ہی محلہ کے لونڈوں کا شور سنائی دیا۔ اس ہاؤ ہو میں بڑوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ یہاں تو پہلے ہی بہانہ چاہیئے تھا۔ قلم رکھا اور بالکونی میں پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دیوانی بھکارن، کپڑوں سے بے نیاز، پیٹ مضحکہ خیز انداز میں ابھرا ہوا، لونڈوں سے بچنے کی کوشش میں ان پر پتھر پھینکنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ لیکن لونڈے اس کی دھمکیوں کا جواب سچ مچ کی سنگ باری سے دے رہے ہیں۔ سڑک کے ایک طرف کچھ نوجوان، لونڈوں کو باڑیں دیتے نظر آئے کچھ بزرگ قسم کے راہگیر بھی یہ تماشا دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھیں بھکارن پر گڑ گئیں — شور ایکا ایکی تھما۔ بھکارن نے پتھر زمین پر پھینک دیا اور اپنے پیٹ پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرنے لگی۔ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے بے خبر وہ کسی پر اسرار خیال میں گم نظر آرہی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اب ہجوم چھٹ جائے گا لیکن اتنے میں کسی نے آتش بازی کی ایک چھچھوندر پگلی پر پھینکی۔ ہجوم سے قہقہوں کا شور بلند ہوا۔ گونگی بھکارن نے ایک بار پھر پتھر اٹھایا۔ اس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور تماشائیوں کے ہاتھ اپنے سروں کی طرف بڑھے۔ دیوانی کے گرد تماشائیوں کا دائرہ پھیل گیا۔ لیکن وہ پتھر جو ہوا میں ابھرا تھا کہیں نہ گرا، دیوانی نے تو اسے اچانک اپنے قریب ہی زمین پر پھینک دیا۔ اسکے پانو آگے کو اٹھے اور ہاتھ ہولے ہولے پیٹ پر پھرنے لگا ؎

رفیق علی

کرب سے کانپ اٹھی مادرِ گیتی کی جبیں
اِک تبسّم سے وہی رنگ ہویدا ہوگا
اِس اندھیرے کے تسلسل سے کوئی چیخ اٹھا
حُسنِ معصوم خیالی کہیں پیدا ہوگا

شمع ماضی کا اجالا بھی تو ہے تیرہ و تار
کِتنا بوسیدہ نظر آتا ہے فانوسِ خیال
کِتنے طوفانوں کی زد پہ بہ لرزتا ہی رہا
اِک سنبھالا لئے بیٹھا ہے بس احساسِ مآل

ہوٹلوں کی سر بلندی پہ مری حسرت اسیر
رقص گاہ و ارغنوں کا کس نے پایا ہے سُراغ
کانپتے ہونٹوں سے صدیوں کی کہانی کہہ چکا
خم رسیدہ اونگھتا سا تنگ گلیوں کا چراغ

جو آج لہروں کی یورش سے تلملاتی ہے
نہ جانے کتنے اسی سطح پر حباب بنے
یہ بحرِ ہستیٔ انساں کا پُر سکوت سماں
کبھی کبھی غمِ دوراں کا حُسنِ خواب بنے

کشمیری لال ذاکر

جیون — دیپک اور بہار

ڈاکٹر چند لمحے پہلے تیسرا انجکشن لگا کے گیا تھا۔ اس دن زندگی میں پہلی بار میں نے اپنے جسم میں انجکشن لگوایا تھا۔ جانے انجکشنوں سے کیوں مجھے خوف آتا ہے۔ ملیریا، ٹائیفائڈ، ہیضہ جب بھی انجکشن لگوانے کی نوبت آئی ہے میں ہمیشہ کھسک جاتا رہا ہوں۔ گھر کے سب افراد نے جب کبھی اپنے دکھتے بازو سنبھالے اور پژمردہ چہروں سے کچھ عرصہ کے لئے گھر کو سوگوار بنایا تو میرے قہقہے کمروں میں گونجتے ہوئے فضا میں بکھر گئے ہیں۔ میں نے اپنے توانا بازو کو بار بار گھما کر گھر والوں کے درد کا کتنی ہی دفعہ مذاق اڑایا ہے — جو لوگ موت سے اتنا ڈرتے ہیں زندگی بھی انہیں موت سے سمجھ کر کے اذیت پہنچاتی رہتی ہے میں ہوں کہ کسی بھی مرض سے نہیں ڈرتا۔ نہ مجھے ملیریا ہی جکڑتا ہے۔ نہ ٹائیفائڈ کے جراثیم ہی حملہ کرتے ہیں، نہ مجھے کبھی ہیضہ ہی ہوتا ہے بیمار بھی ہوئے ہو تو تمہیں لوگ۔ ایک تو اپنا جسم چھدواتے ہو اور دوسرا بیماری کا دکھ بھوگتے ہو — گھر والوں کو شاید کبھی خیال بھی نہ آیا ہوگا۔ کہ میری اس بڑ اور شیخی کی تہ میں کونسا جذبہ کام کرتا تھا۔ یہ میری بہادری نہیں بزدلی تھی۔ میں دنیا کی ہر تلخ شے سے فرار چاہتا ہوں۔ انجکشن کی چند لمحوں کی تکلیف سے بھاگ جانے کی کامیاب کوشش ہی میری اس شیخی کا کارن تھی۔ ورنہ کیا میں موت سے نہیں ڈرتا؟ اس معاملے میں سب سے زیادہ بزدل شائد میں ہی ہوں۔ بہت سال کی بات ہے۔ ہمارے سونے والے کمرے کی چھت پر بجلی کے بلب کے عین اوپر کم بخت بھڑوں نے ایک بڑا سا چھتہ بنا رکھا تھا۔ انہیں کئی دفعہ بھگایا لیکن چند ہی گھنٹوں میں پھر وہ اپنے ٹھکانے پر واپس آجاتیں۔ صرف جلایا نہیں تھا انہیں وہ اس لئے کہ کہیں بجلی کے تار کو آگ نہ لگ جائے اور کمزور بھڑوں کو بے خانماں کرتے کرتے خود بھی بے گھر نہ ہو جائیں۔ اور ایک رات چھتے میں سے شائد کسی بھڑ کا بچہ نیچے گر پڑا۔ وہ اس کے پیچھے اڑتی اڑتی میری چارپائی پر آگری اور میری گردن میں ڈنک مار دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے تپتی ہوئی سوئی میرے جسم میں چبھو دی ہے۔ میں چیخ اٹھا، سبھی گھر والے جاگ پڑے۔ بجلی کا بٹن دبایا گیا، روشنی میں دیکھا کہ ایک بھڑ میری چارپائی کے قریب اپنے بچے کو ٹانگوں میں دبا کر اڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے اپنی کمزوری پر خفت ضرور ہوئی لیکن میں اس رات ایک لمحہ بھی نہ سو سکا۔ تپتی ہوئی گرم سوئی نے تمام رات مجھے مضطرب کئے رکھا۔ اور بھڑ کے اس ڈنک کا نشان کتنا ہی عرصہ میری گردن سے نہ مٹا —

ان دنوں میں انجکشن کی تکلیف سے واقف نہ تھا۔ میری زندگی میں تجربات نے لاتعداد کچھ کے بھر کے اسے نڈھال نہیں کیا تھا — لہٰذا اس دن جب ڈاکٹر نے میرے بائیں بازو میں انجکشن کیا تو میری آنکھوں کے سامنے فوراً بھڑوں کا وہ چھتہ گھوم گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کئی بھڑوں نے مل کر ایک ہی جگہ پر مجھے ڈنک مار دیا ہے۔

"آپ بڑے کمزور دل ہیں موہن صاحب"۔ ڈاکٹر نے شاید میرے چہرے کے اڑتے ہوئے رنگ سے میرے حوصلے کا اندازہ لگا لیا۔

"جی ہاں"۔ میں آنکھیں بند کئے اپنے بازو کو دبا رہا تھا۔

"اسے سینک کیجئے، تین گھنٹوں کے بعد میں پھر آجاؤں گا —"

اور مجھے یوں لگا کہ میں نے انجانے میں بھڑوں کے کسی چھتے کو چھیڑ دیا ہے۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنی گردن پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ شائد کسی پرانے داغ کو کھوج رہا تھا۔

بستر پر بیٹھے ہوئے میں بار بار گھڑی کی سوئیوں کی طرف دیکھتا تھا۔ جیسے وہ جاگ رہی ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ چھوٹی، کبڑی، رینگتی ہوئی سوئی اس دن رفتار میں بڑی سوئی سے بھی تیز چل رہی تھی۔ تین گھنٹے پل بھر میں بیتتے جاتے تھے۔ پہلے تو صرف ایک بازو کو تکلیف تھی اب دونو چھد گئے۔ میرا ڈاکٹر بھی شائد مساوات میں یقین رکھتا تھا۔ دونو بازوؤں میں ایک جیسا درد ہونا چاہیئے، سکھ نہ سہی اذیت

تو آپس میں بانٹی جانی چاہیئے ——— میں نے خیالات کی رو کو بدلنے کے لئے ایک دن پہلے کی ڈاک سے آیا ہوا ایک تازہ ادبی ماہنامہ نکالا۔ ایڈیٹوریل کی پہلی چند سطریں ہی میرے دماغ میں گڑھ گئیں۔

"اس ہفتے ایڈیٹر کا بھیجا ہوا ایک ایسا پرچہ ڈاک خانے سے واپس آیا۔ جس پر ڈاکیئے نے پنسل سے لکھا تھا 'مکتوب الیہ کا انتقال ہو گیا لہذا واپس ہے'، پرچہ پلٹ کر دیکھا تو لکھا تھا پنڈت اندر جیت شرما ———"

اس کے بعد پنڈت جی کے گیتوں کی تعریف تھی اور ان کے اخلاص کو سراہا گیا تھا۔" اردو کو ایسا گیت لکھنے والا مدت تک نہیں ملے گا۔ شرما جی کہنے کو تو مر گئے لیکن جب تک ان کے گیت زندہ ہیں اور جب تک ہماری دیہاتی دوشیزائیں انہیں ندی کے کنارے کے جھرمٹوں میں گاتی اور شہری دلہنیں اپنی معطر تنہائیوں میں گنگناتی رہیں گی وہ خود زندہ رہیں گے اور ہمیں زندگی سے ہمکنار کرتے رہیں گے ———"

میرے بیمار جسم کی رہنمائی کرنے والا میرا بیمار دماغ اپنی ہی الجھنوں میں ڈوب گیا ——— زمانہ کے ایک اتنے بڑے حادثے کو چند سطریں لکھ کر فراموش کر دیا گیا تھا، وقت کی پہاڑی سے لڑھکتی ہوئی ایک چٹان نے چند لمحے گڑگڑاہٹ پیدا کرنے کے بعد فضا میں ایک مستقل سکوت بھر دیا تھا، آسمان کی وسعت سے ایک تابدار تارے نے ٹوٹ کر ماحول کو ایک ساعت کے لیئے جگمگا کر ایک گہری تاریکی میں غرق کر دیا تھا، ایک مدھر نغمہ پیدا کرنے کے بعد ساز کے تار جھنجھناہٹ سے ٹوٹ کر محفل کو افسردہ کر گئے تھے ——— شرما صاحب مر گئے تھے۔ ایک بہار خزاں کے جھونکوں سے گھسٹتی ہوئی دم توڑ گئی تھی، گلشن کا ایک خوشنما پھول سوکھ کر شاخ سے جدا ہو گیا تھا، نور کی ایک شمع ماحول کو روشن کر کے سرد ہو گئی تھی ——— اُردو کو ایسا گیت لکھنے والا شاید مدت تک نہ ملے ——— ! کتنی غلط بات تھی۔ اردو کو تو ایسا فنکار کبھی نہ کبھی مل ہی جائے گا۔ لیکن شرما صاحب کے بچوں کو ان کا شفیق باپ اب نہ ملے گا، ان کی بیتی کو اب کوئی سہاگن نہ کر سکے گا، ان کی عزیز ہمشیرہ کو راکھی باندھنے کے لیئے اپنے بھیا کا بازو نہ ملے گا، اسے اب یہ سہارا کبھی نصیب نہ ہو گا، ان کی جوانی کی محبوبہ کی مانگ کو تخیل کے موتیوں سے بھرنے والی انگلیاں کبھی اس کے کالے کالے بالوں سے نہ الجھیں گی ——— بہار پھر بھی آئے گی لیکن گذشتہ بہار کے اجڑے ہوئے آشیانوں کو اب کوئی نہ بسائے گا، چمن میں پھول اب بھی کھلیں گے لیکن مُرجھا چکے ہوئے پھولوں کو پیار کرنے والوں کے دل کون گرمائے گا؛ محفل کو تو کوئی اور شمع بھی روشن کر دے گی لیکن بجھ چکی ہوئی شمع کے پرستار پروانوں کو اب قوت پرواز نہ ملے گی ——— زندگی کا دریا تو اپنی مخصوص رفتار سے حرکت کرتا ہی رہے گا۔ لیکن کناروں سے وہ جانی پہچانی لہریں جن سے وہ ہم آغوش ہوتے تھے ہمیشہ کے لئے چھن گئی تھیں۔

"کیسی ہے طبیعت کمل کے پتا جی کی ؟" جیسے کسی نے پودے کو ہلا کر شبنم کے ان گنت قطرے نیچے اُگے ہوئے پھولوں پر گرا دیئے ہوں ——— پرکاش آئی تھی۔

"ڈاکٹر تین انجکشن لگا گیا ہے، اب چوتھے کی باری ہے کل پندرہ انجکشن لگنے ہیں ———" میری بیوی جواب دے رہی تھی۔

"پندرہ انجکشن ——— !" کتنا استعجاب تھا اس کی آواز میں۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنے دکھتے ہوئے بازوؤں کی طرف دیکھا اور پھر میری نگاہیں گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک بجنے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔ اور پانچ منٹ تک ڈاکٹر آ جائے گا۔ ایک اور سوئی میرے جسم میں چبھونے کے لئے ——— "بھگوان جلد اچھا کر دے ان کو، ان کے بغیر تو سارا محلہ سونا ہو گیا ہے ———" محلہ تو نہیں مگر اس کا من ضرور سونا ہو گیا تھا۔ اب اس میں صرف میرے سپنے ناچا کرتے تھے، صرف چند بنتے بگڑتے سائے ——— مگر سائے بھی تو کڑکتی ہوئی دھوپ سے جھلسے ہوئے آنگن میں بھلے معلوم ہوتے ہیں، اور اس کا من ایک تپتا ہوا میدان ہی تو تھا۔

پرکاش کی باتوں سے مجھے چوٹ سی لگی۔ ادبی ماہنامہ سرہانے کے نیچے رکھتے ہوئے میں نے ایک عجیب سی کیفیت کا احساس کیا جیسے کوئی کسی غم سے بھرے انسان کو ہمدردی کے چند الفاظ کہہ کر رُلا دے۔ میرا من جیسے رونے لگ گیا تھا۔ اس بہار کے لئے جو گذر گئی تھی، اُس پھول کے لئے جو مرجھا گیا تھا، اس دیپک کے لیے جو بجھ گیا تھا، اس لہر کے لئے جو کنارے سے ٹکرا کر جانے کہاں چلی گئی تھی ——— جانے کہاں؟

اچانک سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی، ڈاکٹر آ گیا تھا ——— باہر پلو کی ایک ہلکی سی لرزش ہوئی، فضا میں ایک سرگوشی تھرکی، گنگنو لال کی

جوڑی کھنکی، ایک کلی چٹکی —— اور اچانک بہار بیت گئی۔ پرکاش چلی گئی تھی۔

پرکاش میرے ہی محلے کی ایک بہو تھی۔ ایک ایسا دیپک جو گھونگھٹ کی اوٹ میں رہ کر بھی سارے گھر کو جگمگا سکتا تھا۔ اس کے کنوارے اور نویلے حسن پر متاہل زندگی کی مہر لگے چار سال ہو گئے تھے۔ اس کا خاوند فوج میں نوکر تھا۔ گھر آنے کے لئے اسے چھٹی نہیں ملتی تھی۔ شادی کے لئے بھی وہ مشکل سے دس دن کی چھٹی حاصل کر سکا تھا —— اور جب سہاگ رات کو اس نے سرخ ریشمی دوپٹے کی اوٹ میں جلتے ہوئے دیپک کو دیکھا تو اس کا مستقبل پروانے کی شکل میں دیپک کی ٹھہری ہوئی لو کے گرد گھومنے لگا۔ وہ دیر تک اس کھیل کو دیکھتا رہا —— اور جب آخر اس نے پرکاش کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھا دیا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے مستقبل کی آنکھیں اتنی تیز روشنی میں چندھیا رہی تھیں۔ دیپک اور بھڑک اٹھا اجالا اور تیز ہو گیا لیکن وہ اس سندر روشنی میں زیادہ دیر محصور نہ رہ سکا۔

—— اسے اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لئے جانا پڑا۔ وہ دس دن کی بجائے تیرہ دن لگا گیا تھا۔ اس کے لئے شاید بچارے کو فوجی قانون کے مطابق کچھ عرصہ قید بھی کاٹنا پڑی تھی۔ قید کے ان دنوں میں بھی اس کی تنہا راتیں اسی دیپک سے جگمگاتی تھیں جس کی روشنی میں ایک رات اس کا مستقبل چندھیا گیا تھا اور جو اب رنگدار گھونگھٹ کے خول میں جل رہا تھا، بھڑک رہا تھا، سلگ رہا تھا۔

پرکاش کبھی کبھار میکے بھی چلی جاتی لیکن اس کا زیادہ وقت اپنے سسرال میں ہی گذرتا، سسرال جو صرف اس کے جیٹھ اور جیٹھانی کے دم سے آباد تھا۔ اس کا جیٹھ پینتالیس کے قریب پہنچ رہا تھا اور جیٹھانی کی عمر بھی چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اُن کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کے ریاہتا جیون میں ہریالی نہ آسکی، ان کی ازدواجی زندگی کا پیڑ کوئی پھل نہ لا سکا۔ پھل تو خیر دور کی بات تھی کسی نے اس کی نازک ٹہنیوں پر پھولوں کے ننھے ننھے جھومر بھی پڑے نہ دیکھے تھے۔ دھرتی خراب تھی یا بیج اچھا نہ تھا کیا کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال دونوں نے اپنی متاہل زندگی کے پچیس سال ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے میں صرف کر دیئے تھے۔

رام چند سمجھتا تھا کہ اس کی بیوی بانجھ ہے اور ویرا خیال کرتی تھی کہ اس کے خاوند میں کوئی نقص ہے۔ اس بات کا ذکر کئی بار اس نے اپنی سہیلیوں سے بھی کیا تھا۔ عورتیں اکٹھی بیٹھ کر جب ایک دوسرے کے راز کریدنے لگتیں تو ویرا بھی اپنے سینے کا رستا ہوا یہ ناسور نہ چھپا سکتی —— اور اب عوام کی رائے رام چند کے ہی خلاف تھی۔ وہ اس کے سنسان آنگن کو دیکھ کر اسی کو دوش دیتے تھے۔ ادھر وہ کئی دفعہ یہ بھی سوچ چکا تھا۔ کہ اسے دوسری شادی کر لینی چاہیئے اور اس طرح بدنامی کا یہ سیاہ ٹیکہ جو اس کی ساری زندگی پر ایک بھیانک اندھیارے کی طرح چھایا ہوا تھا سہاگ کی سُرخ بندی میں بدل دینا چاہیئے — سرخ بندی جو اس کی زندگی کے افق میں لمحہ بہ لمحہ جمتی ہوئی سفید برف کو منور کر دے مگر کئی وجوہات کی بنا پر وہ دوسری بار دولہا نہ بن سکا اور اس طرح اس کے آنگن کی ویرانی اس کی عمر کی طرح بڑھتی ہی گئی —— اس کی زندگی کا افق ڈوبتے ہوئے سورج کی کانپتی ہوئی کرنوں کا بھی سہارا نہ پا سکا۔

اس گھٹے گھٹے اور ویران ماحول میں پرکاش سانس لے رہی تھی۔ ہر خط میں اس کے خاوند نے چھٹی پر آنے کی امید دلائی تھی۔ اور ہر بار پرکاش کی یہ آس ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے جانے کتنی بار اپنے رس بھرے خوابوں کو تنہائی کی تلخ راتوں میں اُجڑتے دیکھا تھا۔ کئی بار من کی سجائی ہوئی سیج کو اس نے تاروں کی ڈھلتی چھاؤں میں نوچ نوچ کر برباد کیا تھا۔ کتنی ہی دفعہ اس کی امید کے روشن چراغ کانپ کانپ کر بے سدھ ہو گئے تھے —— گوبند ہر تہوار پر پہنچنے کی آس بندھاتا لیکن ہر تہوار کی شام ایک زہریلے بچھو کی طرح اس کے دھڑکتے ہوئے سینے سے چمٹ جاتی اور وہ غم و غصہ کے ملے جلے جذبات کے زیر اثر اپنے سرسراتے ہوئے ریشمی کپڑے اور چمکتے ہوئے طلائی گہنے اتار پھینکتی اور پھر اسے محسوس ہوتا کہ بچھو کو سینے سے الگ کرنے سے پہلے وہ اس کے ڈنک کی زد میں آچکی تھی —— اور ایک دہکتا ہوا انگارہ اپنے ہاتھوں میں مسلتے ہوئے وہ جھروکے سے نظر آنیوالے چند مخصوص تاروں کو رات کے ویران آتشدان میں سسکتے ہوئے دیکھتے دیکھتے تھک کر سو جاتی۔

پہلے دو سال اُسے گوبند کے خط متواتر آتے رہے۔ تیسرے سال خطوں کے پہنچنے میں بے قاعدگی بڑھنے لگی اور چوتھے سال کے آغاز

سے تو خط آنے سرے سے بند ہی ہو گئے۔ ایک اور عجیب سی بات بھی تھی جو پرکاش کے معصوم دل و دماغ نہ سمجھ سکے تھے۔ پہلے دو سال رام چند اس سے کچھ شرماتا اور ہچکچاتا رہتا تھا۔ اگر بے خبری میں کہیں پرکاش نے گھونگھٹ اٹھا رکھا ہو تو وہ خود ہی آنکھیں نیچی کر لیتا اور شرما کر ایک طرف ہو جاتا۔ گھر میں قدم رکھنے سے پہلے کھنکارتا۔ اس کا یہ بناوٹی کھنکارنا اس کی آمد کی، اطلاع ہوتی اور ویرا پرکاش کو سنبھل کر بیٹھنے کی تاکید کر دیتی —— تیسرے سال اس کا جھینپنا اور سکڑنا بے تکلفی میں بدلنے لگا۔ کئی دفعہ باتوں ہی باتوں میں وہ کہتا۔ "پرکاش تمہیں مجھ سے پردہ نہ کرنا چاہیئے۔ کسی وقت ویرا گھر پر نہیں ہوتی تو تم میری کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتیں۔ تمہیں اپنی بات کہنے کے لئے بھی کسی دوسرے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ بھی کیا زندگی ہوئی کہ تم اپنی کسی ضرورت کا بھی اظہار نہ کر سکو۔" بات ٹھیک تھی۔ پرکاش کو کتنی ہی بار اس تکلیف کا احساس ہوا تھا۔ ابھی چند ہی دنوں کی بات تھی اس نے اپنے جھمکوں کی جوڑی کا ڈیزائن تبدیل کرانا چاہا تھا لیکن اس کی جیٹھانی رضامند نہ تھی۔ بغیر اس کی رضامندی کے وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اور اس طرح دوسرے کئی چھوٹے چھوٹے کاموں کی طرح اس کے جھمکوں کا نیا ڈیزائن بھی نہ بن سکا تھا۔

"کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا پرکاش"؟ ویرا کی شدید مخالفت کے باوجود آخر پرکاش نے ایک دن گھونگھٹ میں سے اپنے جیٹھ کی طرف دیکھا وہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے بیسوں دفعہ کے دہرائے ہوئے سوال کے جواب کا منتظر تھا۔ اس نے حالات کو سمجھنے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی ٹھیک ہے —" رام چند نے محسوس کیا جیسے ان لفظوں میں شہد کی مٹھاس تھی۔

اس کے بعد اپنے گھٹے گھٹے اور تلخ ماحول میں پرکاش پردے کے جھنجھٹ سے آزاد ہو گئی۔ دیپک کے گرد لپٹا ہوا کاغذ اتر گیا۔ اب رام چند کا امروز اس کی تیز روشنی میں چوندھیانے لگا۔ سمندر پار سے آنے والے خطوں میں بے قاعدگی بڑھنے لگی اور گھر میں اچھی اچھی چیزیں اور نئے نئے کپڑے آنے لگے —— اب پرکاش کے جھمکوں کے ہی نہیں ہار اور کنگن کے بھی نئے ڈیزائن بن گئے تھے۔ اب وہ اپنی ضرورت کا اظہار خود کر سکتی تھی۔ چار سال سے چھنی ہوئی اس کی زبان اب اسے واپس مل گئی تھی اور اس کی زبان میں پھولوں کا رس تھا اور شہد کی مٹھاس تھی ——

ویرا نے کئی دفعہ محسوس کیا کہ اس کا خاوند اپنا بہت سا وقت بال کالے کرنے، واڑھی بنانے اور اپنے آپ کو جوان ثابت کرنے میں صرف کرتا ہے۔ اس نے کئی دفعہ رام چند کو آئینے کے سامنے کھڑے عجیب عجیب حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ اس کی مری ہوئی نسائیت آخر جاگ پڑی۔ اس کے سینے کا رستا ہوا ناسور زیادہ دکھ دینے لگا، اس کے ماضی کی سرد راکھ پھر سے تپنے لگی — اور ایک گھڑی ایسی بھی آگئی جب اس نے اپنے ذہن میں دیورانی کی تصویر کو ایک دلہن کی شبیہ میں بدلتے ہوئے پایا۔ اس نے اپنے آپ ہی پرکاش کو اپنی سوت سمجھ لیا۔ پرکاش کی معصوم ہنسی اسے زہریلے تیر کی طرح چبھنے لگی، اس کا شفاف اور چمکتا ہوا چہرہ اسے دہکتا ہوا ایک انگارہ دِکھنے لگا۔ جو اس کے جیون کے کھلیان کو تباہ کرنے والا تھا، اس کی رس بھری باتیں اسے رِس رہے امرت کی بوندیں نظر آنے لگیں —— اور آخر ایک ہی گھر میں رہنے والی دو عورتیں قطبین کی سی دوری پر جا پڑیں۔

چوتھے سال کے آغاز میں ہی میں جانے کیسے محسوس کرنے لگا۔ کہ گھونگھٹ کی اوٹ میں جلنے والے دیپک کی روشنی میری زندگی کے اندھیرے خلا میں جھانکنے لگی تھی۔ میں نے کئی بار پرکاش کو عجیب انداز سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ اور میں نے محسوس کیا۔ کہ اس کے دل کا آنگن سونا ہو رہا تھا۔ لیکن آنگن کے گرد بنی ہوئی دیوار اتنی اونچی تھی کہ باہر کی کوئی شے وہاں نہ پہنچ سکتی تھی۔ میں نے اسے اپنے سونے آنگن کو حسرت بھری نظروں سے تکتے ہوئے بارہا دیکھا اور جانے کیسے اور کیوں اس نے ایک دن اپنی آنکھیں ایک چور دروازے کی طرف گھمائیں —— چور دروازہ —— سوچتا ہوں کہ مضبوط سے مضبوط قلعہ بھی کوئی نہ کوئی چور دروازہ ضرور رکھتا ہے، اونچی سے اونچی دیوار بھی اپنے سینے میں کہیں کوئی شگاف ضرور چھپائے ہوتی

ہے، ہر انسان اپنے دل میں چاہے وہ کتنا ہی بھرا پڑا ہو جب چاہے ایک آدھ خلا ضرور دیکھ سکتا ہے - دنیا کی عقاب ایسی تیز آنکھوں کے سامنے اور دن کی ہر اندھیرے کونے کو چمکا دینے والی روشنی میں بھی چور دروازے سے کسی کو بلا کر اپنے سونے آنگن کو نغموں، قہقہوں اور معطر سانسوں سے آباد کیا جا سکتا ہے -

پرکاش میری بیوی سے باتیں کر رہی تھی - میں کئی دن سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ میری بیوی سے زیادہ میل جول بڑھا رہی تھی - یہ تو میں نے ضرور کہیں پڑھا تھا کہ اگر تمہیں کسی عورت کے دل میں جگہ پیدا کرنی ہو تو اس کے بچے کو پیار کرو، اگر کسی لڑکی سے محبت کرنا چاہو تو اس کے بھائی سے خوب راہ و رسم بڑھاؤ مگر یہ میرے تجربے سے باہر کی بات تھی کہ کسی مرد کو اپنانے کے لئے اس کی بیوی ہی موزوں ذریعہ ہے یعنی کسی گھر کو لوٹنے کے لئے اس کے مالک کی مدد ہی سب سے بڑی مدد ہے ——

بہر حال گفتگو رازدارانہ انداز کی تھی اونچی آواز میں ہو رہی تھی ——

"جب میری جیٹھانی گھر پر نہیں ہوتی میرا جیٹھ عجیب عجیب سی حرکتیں کرنے لگتا ہے - جیسے وہ پاگل ہو رہا ہو - اس پر ایک گھبراہٹ کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے، اس کے چہرے سے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے وہ کسی غیر کے گھر میں چوری کر رہا ہو - باتوں میں عجیب سی لرزش، چال میں عجیب سی لغزش، آنکھوں میں عجیب سی چمک — جانے کیا ہو جاتا ہے اُسے - کبھی کہنے لگتا ہے، ویرا کتنی بیوقوف ہے - وہ سمجھتی ہے کہ پیار بھی کوئی سودا ہے - شادی کے اس پچیس سال کے لمبے عرصے میں بھی میں اسے پیار نہیں کر سکا - مگر تم کتنی اچھی ہو پرکاش —! اور میں آنکھیں نیچی کئے اٹھ کر آنگن میں چلی جاتی ہوں - وہ آنگن میں بھی آ پہنچتا ہے - اور کہنے لگتا ہے، دل کو لاکھ پتھر کریں مگر ایک دن وہ پگھل کر موم سے بھی نرم ہو جاتا ہے - صبر بڑی چیز ہے —" جی میں آتا ہے کہ اسے کوئی کھرا سا جواب دوں مگر چپ رہنا ہی مناسب سمجھتی ہوں - اور اگر ایسے لمحے کبھی ویرا باہر سے آ جائے تو وہ غصہ سے آگ بھبوکا ہو جاتی ہے -

' اپنے بڑھاپے کی تو لاج رکھو، شرم کرو کچھ '- اور وہ ایک کھسیانی سی ہنسی سے اپنے چہرے کو مکروہ بناتے ہوئے کہنے لگتا ہے -

' پرکاش کو سمجھا رہا تھا کہ گوبند کے خط نہ آنے سے تمہیں گھبرانا نہیں چاہیئے - یہاں کئی گھر ایسے ہیں جنہیں اپنے مردوں کے متعلق جب سے وہ جنگ میں بھرتی ہوئے ہیں کوئی خبر نہ ملی تھی - لیکن اب پتہ چلا ہے کہ وہ جاپان میں جنگی قیدی ہیں - ہیرا سنگھ کو تو جانتی ہی ہو اس کے بیٹے کے متعلق ابھی کل ہی —— '

' بس بکواس بند کرو ' ویرا کڑکتی ہے -

' ہماری باتیں بکواس ہی تو ہیں، کیوں نا پرکاش ؟ ' اور وہ اس انداز سے میری طرف دیکھتا ہے کہ میں شرم سے زمین میں گڑ جاتی ہوں - جی میں آتا ہے کہ اس وحشی درندے کے منہ پر اس کی بیوی کے سامنے ہی تھوک دوں - مگر خاموش ہی رہتی ہوں -

پرکاش اس ڈھنگ سے باتیں کر رہی تھی جیسے وہ مجھے ہی سنانے کی غرض سے ہوں —— میں سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ ایک بے سدھ جوانی کو ایک بار جھنجھوڑ کر پھر اس سے سو جانے کی امید کرنا کتنی غلطی ہے، طوفان کو اپنی پوری قوت سے بڑھ چکنے کے بعد روکنا کتنا مشکل ہے! میں افسوس کر رہا تھا گوبند کی ذہنیت پر - اگر شادی کر کے اسے واپس محاذ پر گولیوں سے کھیلنے کے لئے ہی جانا تھا تو شادی کی کیا ضرورت تھی — " ابھی کل ہی کی بات ہے بہن، تم سے کیا چھپاؤں، اور کسی سے تو کہتے بھی شرم آتی ہے —" پرکاش نے پھر بولنا شروع کر دیا تھا، کم بخت کی زبان میں کتنا رس تھا ——

" ویرا گھر پر نہیں تھی - مندر میں کوئی مہاتما آئے ہیں، ان کی کتھا سننے گئی تھی وہ - آج کل اسے ست سنگ کا شوق پیدا ہوا ہے - جب تک وہ گھر پر ہوتی ہے میں سمجھتی ہوں کہ میں محفوظ ہوں لیکن جب وہ باہر چلی جاتی ہے تو میں ڈرنے لگ جاتی ہوں - یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب میں حملے کی زد میں ہوں —— جوں ہی وہ باہر گئی اس نے ویرا کے ٹرنک اور اپنا ٹرنک کھول کر اتھل پتھل شروع کر دی - میں حیران تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے - تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے میری جیٹھانی کے سارے گہنے لا کر میرے سامنے رکھ دیئے اور کہنے لگا -

' یہ سب تمہارے ہیں پرکاش - تم خواہ مخواہ اپنی جوانی برباد کر رہی ہو - یہ عیش کے دن ہیں اور تم نے اپنی جان کو غم کا روگ لگا رکھا ہے

گو بند جانے کب آئے گا، کتنی مدت سے تو اس کا کوئی خط بھی نہیں آیا۔
—— اور پھر اس نے گہنوں کی صندوقچی میرے اور قریب کر دی مجھے اس
کی کمینگی پر آگ سی لگ گئی۔ اپنے چھوٹے بھائی کی امانت کو ہڑپ کرنے کی
کوشش —— ! وہ کتنا دھوکہ باز اور مکار شخص ہے۔ میں نے وہ
صندوقچی باہر آنگن میں پھینک دی اور خود گھر سے باہر چلی آئی۔ میں نے تہیہ
کر لیا کہ شام کو اپنا سامان اٹھوا کر میکے چلی جاؤں گی۔ جب شام کو میں اپنا
سامان سنبھال رہی تھی تو مجھے خطوں کا ایک پلندہ ملا۔ ٹرنک کھولتے اور
بند کرتے وقت اس مکار شخص نے شاید "ان" کے سنبھال کر رکھے ہوئے
یہ خط ان جانے میں گرا دیے تھے۔

میں ان خطوں کو دیر تک اکیلی بیٹھ کر پڑھتی رہی۔ وہ متواتر خط لکھتے
رہے تھے اور ان کے خطوں میں میری طرف سے جواب نہ ملنے پر سخت
ناراضگی کا اظہار تھا۔ اس کمینے شخص نے ان خطوں کو جان بوجھ کر مجھ
سے چھپائے رکھا تھا۔ ان کے آخری خط پر دو مہینے پہلے کی تاریخ ہے۔
وہ سنگاپور میں ہیں اور راضی خوشی ہیں۔ اس خوشی نے آج میرے دل میں
جما ہوا دکھ اور غم کا میل دھو دیا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے
میں نے دوبارہ زندگی پائی ہے، جیسے میرے جیون کی کھوئی ہوئی بہار
لوٹ آئی ہے، جیسے میری آس کا بجھتا ہوا دیپک پھر سے بھڑک اٹھا
ہے —— میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں یہیں رہوں گی اور اس ہتیارے
کا مقابلہ کروں گی۔

اس طرح ایک جاگے ہوئے شباب نے چور دروازے کی مدد سے
اپنا سونا آنگن بسا لیا، اور اندھیری راہوں پہ گھسٹتے ہوئے مجھ جیسے انسان
نے اپنے قدم اٹھانے کے لئے گھونگھٹ میں جلتے ہوئے جوانی کے
دیپک کی روشنی پائی۔ میں نے اپنی بے کیف متاہل زندگی کے خزاں
رسیدہ باغ میں پھر چند تازہ کونپلیں پھوٹتی دیکھیں چند کلیاں چٹخیں
اور میرے فن نے ایک اور منزل طے کی۔ دراصل ہم فنکار لوگ کسی کو
پیار نہیں کرتے، ہم صرف اپنے آپ سے اور اپنے فن سے پیار کرتے
ہیں۔ کسی شے کو مستقل طور پر اپنائے رکھنا ہمارے بس کی بات نہیں،
ہم کبھی اور کسی چیز سے مطمئن نہیں ہو سکتے —— اور یہی ہے ہماری فنی
ترقی کا راز ——

اچانک میرا دایاں گردہ خراب ہو گیا۔ درد گردہ کے پے بہ
پے دورے میری نڈھال جوانی سے کھیلنے لگے۔ اور چند مہینوں میں
ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔ ہر پندرہ دن کے بعد میرا جسم
درد کے شکنجے میں کس دیا جاتا۔ مارفیا کے انجکشنوں نے شاید میرے
خون میں بھی زہر گھول دیا تھا —— بیماری میں گھر والوں کا مذاق اڑانے
والا انسان دور پردیس میں زندگی اور موت کی مخلوط راہوں پر رینگنے
لگا —— جانے دکھ کے دنوں میں کیوں کسی کے پیار اور ہمدردی
کی آرزو بڑھنے لگتی ہے، کسی ایسے متنفس کی آرزو جو قریب نہ رہ
سکے اور دور ہی سے اپنے پیار کی روشنی پھینک سکے —— اپنی
بیوی کی تھکی ہوئی جوانی سے جانے میں کیوں سیر سا ہو گیا تھا۔ زندگی
میں ایسے لمحات کی کمی نہیں جب ہم اپنے قریب کی چیزوں سے سیر
ہو جاتے ہیں اور دور کی چیزوں کے پیچھے بھاگنے کی ناکام کوشش کرنے
لگتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم ایک سراب کو پکڑنے کی سعی کر رہے
ہیں ہم اپنے عمل سے باز نہیں آتے —— میرے نڈھال جسم و رُوح
بھی ہر گھڑی ایک سراب کی جھلکیوں کو ترستے رہتے۔ پرکاش دن
میں دو بار بیمار پرسی کے لئے آتی، ایک دفعہ صبح اور دوسری دفعہ
شام کو۔ میرے لئے صبح کو شام میں تبدیل کرنا یوں تھا جیسے کوئی مسافر
کسی نخلستان سے نکل کر دن بھر صحرا کی خاک چھانتا ہوا، تپتی ہوئی
ریت سے پاؤں جھلستا ہوا، بگولوں سے الجھتا ہوا دن ڈھلنے کے
قریب ایک اور نخلستان میں پہنچ جائے اور رات بھر کبھی صحرا کی چلچلاتی
ہوئی دھوپ کے دھوکوں اور کبھی نخلستان کے جھرنوں کے گیتوں کے
خواب دیکھتا ہوا صبح پھر اپنا صبر آزما سفر شروع کر دے —— میری
زندگی کیسا کٹھن سفر طے کر رہی تھی۔ درد کی ہر لہر پر مجھے محسوس ہوتا
کہ میری زندگی دہکتے ہوئے انگاروں پر سے گزر رہی تھی۔ میں جل رہا تھا۔
پھنک رہا تھا، سلگ رہا تھا۔ لیکن جانے کس کارواں کی بانگ جرس
مجھے اپنے پیچھے پیچھے گھسیٹے لئے جا رہی تھی۔ شاید وہ فنا کی وادیوں
میں گونجتی ہوئی سُریلی آواز تھی۔ جو مجھے مسحور کر رہی تھی اور میں ہانپتا
ہوا، ماتھے سے پسینے کے قطرے پونچھتا ہوا ضعف سے لرزتا ہوا
بڑھ رہا تھا —— آگے —— بہت آگے —— اور اس طرح چلتے

چلتے کبھی کبھی میں ماحول کو تکنے کے لئے ٹھہر جاتا، اپنی منزل کا دھیان کرتا جہاں مجھے پہنچنا تھا - اور ایکدم چاہنے لگتا کہ میں لوٹ جاؤں یا کوئی بڑھ کر میرا راستہ روک دے ـــــ اور موت کا بھیانک تصور میری آنکھوں کے سامنے گھوم کر مجھے خوفزدہ کر دیتا - میں محسوس کرتا کہ میرا فن بھی ان پرہول راہوں پر رینگنے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا. میرا فن بھی میری طرح مجبور تھا -

دن میں جانے کتنے ہی افسانوں کے پلاٹ میرے دماغ میں آتے جانے میں کتنے ہی سپنے دیکھتا، ماضی کے کتنے ہی نقوش ابھارتا مستقبل کے ایوان کو کتنا ہی سجاتا لیکن درد کے ایک ہی ہچکولے سے سارے پلاٹ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے، سپنے بکھر جاتے، نقوش گرد سے اٹے جاتے اور مستقبل کا ایوان ایک دم ڈھہ جاتا اور میں اپنے گرد ایک مہیب و بسیط خلا پھیلتے ہوئے پاتا - مجھے محسوس ہوتا کہ یہ اندھیری غار اب مجھے نگل جائے گی ـــ لیکن اچانک جانے کیسے دور اندھیرے کی گہری تہوں میں سے روشنی کی ہلکی سی چند شعاعیں ابھرنے لگتیں، وہ ابھرتے ہی جاتیں حتیٰ کہ میری آنکھوں کے سامنے ایک دیپک کی لَو لرزنے لگتی - سوئے ہوئے سپنے کروٹ لینے لگتے اور میں محسوس کرتا کہ میری زندگی کی اُجڑی ہوئی بہار دھیرے دھیرے لوٹ رہی ہے۔

ڈاکٹروں نے مشورہ دیا تھا کہ مجھے Penicillin کے انجکشن لگوانے چاہئیں - انہیں اس نئی دریافت پر بہت اعتماد تھا ـــــ میں راضی ہو گیا ـــــ انجکشن کے کورس کے بعد میں پھر ایک بار نارمل انسان بن سکوں گا، ہڈیوں تک کو پگھلا دینے والے درد کی لہروں سے بچ جاؤں گا، اپنی گرتی ہوئی صحت کے ساتھ ساتھ جو فسردگی میرے ذہن پر چھا رہی تھی وہ چھٹ جائے گی، ایک دفعہ پھر میں زندگی کی گوناگوں دلچسپیوں میں حصہ لے سکوں گا - ان خیالوں نے مجھے اپنے جسم کو کچھ گھنٹوں کے لئے سوئی کی تیز نوک کے حوالے کر دینے کے لئے تیار کر لیا اور جب میں پہلا انجکشن لگوا چکا تو میرے چہرے پر تھکن کے ایسے گہرے نشان ابھر آئے کہ ڈاکٹر بھی سہم گیا - اور اس کا یہ کہنا کہ میں بہت کمزور دل کا انسان ہوں میں نے شکریہ سے قبول کیا - اس نے میری فطرت کو کتنی جلدی بھانپ لیا تھا -

خود کو اڑتالیس گھنٹوں تک سوئیوں کی چبھن اور چھوٹے چھوٹے زخموں کے درد کے حوالے کر دینے کے بعد جب میں فارغ ہوا تو بخار کی شدت سے پگھلنے لگا - پہلے آٹھ انجکشنوں کے دوران میں پرکاش کتنی ہی دفعہ آئی - اس کی ہر آمد پر میں ایک اور انجکشن کے لئے تیار ہو جاتا - اس کا آنا میرے لئے ہمت اور راحت کا پیغام ہوتا - لیکن آخری سات انجکشنوں کے دوران میں وہ صرف ایک آدھ بار آئی - اور پھر اس کی آواز کی مدھر گونج میرے کانوں تک نہ پہنچ سکی، اس کے کنگنوں کی کھنک سنائی نہ دی، اس کا رنگدار پلو فضا میں نہ لرزا - ـــــ بخار سے تپتا ہوا میرا دماغ اب صرف اس کی یاد کے خنک سائے میں سکون محسوس کر رہا تھا، نظارہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا اب صرف اس کے سپنے ذہن کو ابھار رہے تھے - میں نے ایک دو بار اپنی بیوی سے پرکاش کے متعلق پوچھنا چاہا لیکن پوچھ نہ سکا -

وہ شام کتنی اداس اور تلخ تھی جب میری بیوی سرہانے بیٹھی میرا سر دبا رہی تھی اور میرا دکھتا ہوا دماغ ماضی کے دریچوں سے گرد و غبار سے اٹے ہوئے کچھ نظاروں کو دیکھ رہا تھا - میں محسوس کر رہا تھا کہ زندگی ایک جگہ نہیں رک سکتی - اسے حرکت کرنا ہی ہے - اب کا دیکھا ہوا سپنا پھر شاید کبھی نصیب نہ ہو، اس لمحہ کو جگمگانے والی شمع شاید پھر کبھی نہ جلے، موجودہ ساعتوں میں گونجنے والے نغمے شاید ہمیشہ کے لئے سو جائیں ـــــ زندگی کسی بھی شے کو ایک جگہ رک کر دیکھنا پسند نہیں کرتی، وہ ہر نظارے کو مختلف زاویوں سے دیکھتی ہے اور ابھی پہلا نظارہ مکمل نہیں دیکھا جا چکتا کہ دوسرا اس کی جگہ آ لیتا ہے ـــــ زندگی کا بہاؤ کسی بھی رکاوٹ سے نہیں رکتا، اسے کسی سے پیار اور دلچسپی نہیں - اسے صرف اپنے فرض کو پورا کرنے کی دھن ہے - اسے صرف بھاگنا ہے اور چند سانسوں کو مٹھی میں بھینچ کر ایک خاص منزل پر فضا میں بکھیر دینا ہے - سانسیں جو ایک بار بکھر کر پھر واپس اپنے مرکز پر نہیں آتیں -

"پرکاش بچاری کا بھی دکھ گیا ـــــ" میری بیوی نے آہستہ سے کہا -

"پرکاش کل چلی گئی"

"کہاں — ؟ میکے — ؟" میرے تحت الشعور نے مجھے بہلانے کے لئے ایک بہانہ سوچا تھا۔ اس کے ہمارے گھر نہ آنے کی ایک وجہ دریافت کی تھی۔ ہمارا تحت الشعور ہمارے اعمال پر کڑی نگرانی رکھتا ہے۔

"نہیں وہ فیروز پور گئی ہے"

"وہ کیسے — ؟" میری آواز میں روکھا پن تھا۔ مجھے یہ سب ایک پہیلی معلوم ہو رہا تھا۔

"گوبند کی تبدیلی اب فیروز پور ہو گئی ہے۔ وہ دو دن کے لئے آیا تھا اور اسے ساتھ لے کر کل چلا گیا۔ کم بخت جاتی دفعہ ملنے بھی نہیں آئی —" اس کے بعد وہ پرکاش کے جیٹھ اور جیٹھانی کے بارے میں کچھ کہتی رہی۔ مگر میرے کانوں نے جیسے ایک دم سننے کی قوت کھو دی تھی۔ میں ویسے ہی گم سُم پڑا تھا۔

اندھیرے کی تہوں میں سے ابھرتی ہوئی روشنی مر گئی تھی، چند چٹخے ہوئے غنچے مکمل کھلنے سے پہلے ہی زمین پر گر گئے تھے، نغمے کی ایک گونج فضا میں تھرک کر ختم ہو گئی تھی، گیت کے ادھورے بول سسک رہے تھے، زندگی کے ساحل پر ٹکرانے والی لہریں اپنی جگہ تبدیل کرتے کرتے غائب ہو گئی تھیں، حیات اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کیلئے ایک بہت گہری کھائی کو رینگ کر نہیں پھلانگ کر عبور کر گئی تھی —— سرہانے کے نیچے پڑا ہوا ادبی ماہنامے کا ایک کونہ اب بھی پنڈت اندر جیت شرما کی موت کی خبر دے رہا تھا۔ اب بھی شاید انہیں کے کسی گیت کے بول 'جیون، دیپک اور بہار —'، زندگی کی وسعتوں میں گونج کر سسک رہے تھے۔ میرے تپتے ہوئے ماتھے کو اب بھی کوئی دبا رہا تھا، میری بیوی —— ایک عورت۔

نقد و نظر

نام کتاب :- "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ"

مصنف :- عبداللہ بٹ

قیمت :- چار روپے

پبلشر :- قومی کتب خانہ لاہور

"یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" مسٹر عبداللہ بٹ کی تازہ تصنیف ہے، مصنف علمی اور ادبی دنیا میں نووارد نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی کتابیں لکھ چکا ہے اور کئی کتابوں کو نہایت سلیقے اور حسن مذاق کے ساتھ ترتیب دے چکا ہے۔ اس کتاب میں اس نے بالکل نئے انداز سے مشاہیر کے سوانح لکھے ہیں۔

مصنف نے سیاسی، معاشی، سماجی حالات میں سے ہیرو کی شخصیت نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور واقعات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ ان کی اصل روح بھی برقرار رہے اور ہیرو کی پوری تصویر بھی سامنے آجائے اور جب اس تصویر کو دوبارہ دیکھا جائے تو وہ سارا ماحول ذہن نشین ہو جائے جس میں ہیرو پیدا ہوا۔ سوانح نگاری کا یہ انداز اس لئے پسندیدہ ہے کہ ہیرو کی شخصیت کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے سیاسی اور سماجی مسئلے بھی سامنے آجاتے ہیں، مشاہیر کی اس بزم میں اقبال، گاندھی، جناح، سٹالین — ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، جواہر لعل نہرو، سبھاش بوس، ہٹلر، مسولینی، چرچل، روزویلٹ، اتاترک، ابن سعود اور چیانگ کائی شیک شامل ہیں۔

کتاب کی لکھائی، چھپائی نہایت عمدہ ہے۔ اور اس میں ان پندرہ مشاہیر کی تصاویر بھی شامل ہیں جو نہایت ہی محنت سے تیار کی گئی ہیں۔

رسالہ ہمایوں

ہمایوں (جوبلی نمبر) صفحات ۲۰۴ سائز $\frac{30 \times 20}{8}$ کتابت اور طباعت عمدہ۔ قیمت دو روپے۔ یہ نمبر رسالہ کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر شائع کیا گیا ہے اور ہمایوں کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ اس پچیس سال کے عرصہ میں پرچہ انتہائی باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا ہے۔

فراہمی مضامین کے سلسلہ میں رسالہ کے ایڈیٹر میاں بشیر احمد اور جائنٹ ایڈیٹر مسٹر یوسف ظفر بی اے نے کافی محنت سے کام لیا ہے اور اس طرح پرچہ مختلف النوع مضامین نظم و نثر کا ایک دلچسپ مرقع بن گیا ہے اس پرچہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مختلف اصناف ادب کا الگ الگ پچیس سالہ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں سید وقار عظیم کا مضمون مختصر افسانے کے پچیس سال بہت اہم ہے۔ باقی مضامین نظم و نثر بھی خوب ہیں۔

جامعہ

(جوبلی نمبر) صفحات ۱۹۴۔ سائز $\frac{29 \times 22}{8}$ کتابت و طباعت قیمت عہ/

حال ہی میں مسلمانوں کی قومی یونیورسٹی جامعہ ملیہ کی پچیس سالہ جوبلی منائی گئی۔ جامعہ کا جوبلی نمبر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں کچھ مضامین جامعہ ملیہ کے متعلق ہیں اور باقی اہم تعلیمی مسائل کے متعلق جن کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی جامعہ ملیہ کو ہندوستان سیاسی تعلیمی اور تمدنی تحاریک کے سلسلہ میں جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ یہ ایک ایسے عزم کا مظہر ہے۔ جس سے ٹکرا کر مخالفت کی کئی چٹانیں پاش پاش ہو گئیں اور بالآخر دوست دشمن کو اس کا مداح ہونا پڑا۔ ان تمام لوگوں کے لئے جو جامعہ ملیہ اور اس کے نصب العین سے محبت رکھتے ہیں۔ اس نمبر کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

نئی کتابیں

دیس سے باہر:- آغا محمد اشرف ایم اے نے دنیا کی سیر و سیاحت کے بعد یہ علمی و ادبی مضامین لکھے ہیں - قیمت مجلد ۶؍

لندن سے آداب عرض:- آغا محمد اشرف ایم کے ان مضامین کا مجموعہ جو جنگ عظیم کے دوران میں بی بی سی لندن سے نشر کئے گئے - مجلد ۱۲؍

ادبستان:- مولانا خلیقی دہلوی کے حسین اور دلکش ادبی مضامین کا مینظیر مجموعہ - آپ ایک بار ملاحظہ فرما کر بار بار مطالعہ فرمائینگے تیسرا کامیاب ایڈیشن قیمت مجلد ۴؍

صبح بہار، اختر ستان، لالۂ طور:- ہندوستان کے نامور رومانی شاعر اختر شیرانی کے مجموعے کلام - ہر جلد خوبصورت گرد پوش سے مزین ہے قیمت فی جلد تین روپے

تذکرہ حسینی:- مولانا علم الدین صاحب کلانچوی علماء اہلسنت والجماعت کی مستند تصانیف و اعمال سے مناقب محرم پر سلیس اردو زبان میں قابل قدر کتاب لکھی ہے قیمت ۸؍

طیور آوارہ:- از اختر شیرانی - قیمت فی جلد تین روپے آٹھ آنے -

جدید اردو شاعری:- پروفیسر عبدالقادر کی مشہور کتاب جس کو قابل مصنف نے ریوائز کر کے جدید شاعری کے موجودہ دور تک مکمل کر دیا ہے - قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے -

معاشیات قومی:- ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے فریڈرش لسٹ کی جرمن کتاب سے براہ راست ترجمہ کیا ہے - قیمت مجلد آٹھ روپے -

تاریخ انقلاب روس:- شیر جنگ کی انقلاب پسند طبیعت نے روس کے انقلابی پس منظر تاریخی و مجلسی رد و بدل کی تاریخ کو الفاظ کا خوشنما جامہ پہنایا ہے - اتنی دلچسپ کہ شروع کر کے ختم کئے بغیر آپ دم نہ لیں گے - قیمت مجلد چار روپے -

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات:- شیر جنگ نے کارل مارکس کے حالات زندگی، اس کی تعلیمات اور اس سلسلہ میں عام جد و جہد کی تاریخ کو دلچسپ انداز میں کئی برس کی محنت سے تحریر کیا ہے - قیمت مجلد چھ روپے -

اوراق پارینہ:- شیر جنگ کے ادبی مضامین کا مجموعہ، جن کا مطالعہ آپ کے ذہن کیلئے نئی راہیں کھول دے گا - قیمت ۱۲؍

رحمۃ للعالمین (کامل تین جلد) قاضی سلیمان منصور پوری کی مشہور عالم سیرۃ نبی الامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم - تینوں جلدوں میں مکمل مجلد سترہ روپے -

مقالات شیرانی:- حافظ محمود شیرانی کے تنقیدی مضامین جو علمی حلقوں میں نہایت بلند درجہ پا چکے ہیں - قیمت تین روپے آٹھ آنے -

دھڑکتے دل:- اختر شیرانی کو آپ اس کی شاعری سے بھی بلند جگہ دیں گے - جب اس کے یہ افسانے آپ ملاحظہ فرمالیں گے قیمت تین روپے

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ:- چوٹی کے ڈراموں کا انتخاب از اختر شیرانی - آپ کا مذاق سلیم داد دیئے بغیر نہ رہے گا - قیمت چار روپے آٹھ آنے -

ماڈرن اردو ڈکشنری:- صاحبزادہ ابو نعیم عبدالحکیم نشتر جالندھری نے اردو کے طالبعلموں اور ضرورت مند اصحاب کیلئے ہر حرف کے ذیل میں تمام ضروری الفاظ درج کرنے کے بعد ضرب الامثال اور قانونی اصطلاحات بھی درج کر دی ہیں - قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے -

ساز فطرت، نیلوفر، صبر و ضبط، قسمت:- حسن عزیز جاوید کے بلند پایہ افسانوں کے چار مجموعے - حسین گرد پوش سے مزین - مجلد قیمت فی جلد ۱۲؍

شیشہ و سنگ، اتفاقات:- خنجر لکھنوی بہت کہنہ مشق بلند پایہ ادیب ہیں - اور دونوں کتابیں ان کے چوٹی کے معاشرتی اور اصلاحی افسانوں کا مجموعہ ہیں - قیمت ۱۲؍ ہم علمی و ادبی اور اسلامی کتابیں اور ٹیکسٹ بکس شائع کرتے ہیں - فہرست کتب مفت طلب فرمائیں ؎

کتاب منزل - کشمیری بازار - لاہور

Regd. No. L 3531